Phone: 7500

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

فروری 1962ء

فاروق اعظم، حضرت عمرؓ کا پہلا خطبہ

خدا کی قسم تمہارا ہر کمزور آدمی میرے نزدیک سب سے قوی ہے تآنکہ میں اس کا حق وصول نہ کر لوں۔ اور تمہارا ہر طاقتور آدمی میرے نزدیک سب سے کمزور تر ہے تآنکہ میں اس سے حق وصول نہ کر لوں۔

(بحوالہ عمر فاروقؓ۔ مصنفہ محمد حسین ہیکل مصری۔ صفحہ ۵۹۲)

شائع کردہ:

ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵-بی گلبرگ لاہور

قیمت ۷۵ پیسے

قرآنی نظام ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

ٹیلیفون نمبر ۵۰۰ ۷	قیمت فی پرچہ	بدلِ اشتراک
خط و کتابت کا پتہ	ہندوپاکستان سے	ہندوپاکستان سے سالانہ: آٹھ روپے
ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵- بی - گلبرگ - لاہور	۷۵ نئے پیسے	غیر ممالک سے سالانہ: ۱۶ شلنگ

نمبر ۲ — فروری ۱۹۶۲ء — جلد ۱۵

فہرست مضامین

لمعات ———— ۲

طلوعِ اسلام کا مسلک ———— ۱۵

روزہ کے احکام ———— ۱۷

باب المراسلات (حج کی اہمیت) — محترم پرویز صاحب ———— ۲۲

سلیم کے نام (محترم پرویز صاحب) ———— ۲۵

حقائق و عبر ———— ۳۳

کیا خدمتِ دین کا معاوضہ لینا جائز ہے؟ (محترم نصیر شاہ میانوالی) ———— ۳۹

رابطۂ باہمی ———— ۵۳

اسلام پر مختلف ثقافتوں کے اثرات (علامہ احمد امین مصری) ———— ۵۷

نقد و نظر ———— ۶۶

احتساب ———— ۷۳

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

اللہ تعالیٰ کی ایک صفت حلیمٌ بھی ہے۔ ہمارے ہاں حلیم، عجز وانکسار، نرمی اور فروتنی کے مفہوم کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ لیکن اس کا بنیادی مفہوم اس سے مختلف (اور ممتاز) ہے۔ اہلِ زبان تحلّم المال اس وقت کہتے ہیں جب مویشی فربہ ہو جائیں۔ چونکہ جو جانور تنومند و توانا ہو اس میں قوتِ برداشت زیادہ ہوتی ہے اس لئے حلیمٌ اُس بھاری بھرکم، ثقہ انسان کو کہتے ہیں جس میں سہار اور برداشت کی اتنی قوت ہو کہ وہ یونہی بات بات پر بھڑک نہ اُٹھے۔ اُسے غیظ و غضب کے موقع پر بھی اپنی طبیعت پر قابو رہے۔ وہ جلد بازی اور اوچھے پن پر نہ اُتر آئے۔ قرآن کریم میں خدا کی اس صفت کو بیان کرنے سے مقصود یہ ہے کہ انسان بھی (علیٰ حدِ بشریت) اس صفت کا مظہر ہو۔ یعنی اس میں، قوت کے باوجود، بردباری، سہار اور برداشت کا مادہ ہو۔ وہ ذرا ذرا سی بات پر آپے سے باہر نہ ہو جائے۔ یہ بڑی مستحسن صفت ہے۔

آپ نے دیکھا ہو گا کہ عام طور پر لوگ صحتمندی اور توانائی کے زمانے میں اچھی برداشت اور سہار کے مالک ہوتے ہیں لیکن بیماری کے زمانے میں جب کمزوری بڑھ جاتی ہے، تو ان کا مزاج چڑچڑا ہو جاتا ہے۔ ان میں قوتِ برداشت بہت کم ہو جاتی ہے۔

جو کیفیت افراد کی ہے، وہی اقوام کی ہے۔ عروج کے زمانے میں شریف اقوام میں بڑی قوتِ برداشت ہوتی ہے۔ لیکن جب کسی قوم پر زوال آجائے تو، بیمار انسان کی طرح اس کا مزاج بھی چڑچڑا ہو جاتا ہے۔ اس میں برداشت کا مادہ بالکل نہیں رہتا۔

چونکہ ہماری قوم بدقسمتی سے، ایک عرصے سے بیمار (روبہ انحطاط) چلی آرہی ہے اس لئے ہمارا قومی مزاج

چڑچڑا ہوگیا ہے۔ مسلمان، زندگی کے کسی گوشے میں ہو، بالعموم شعلہ صفت اور تنک مزاج واقع ہوا ہے۔ وہ دوسرے کی بات سہارتا ہی نہیں۔ مخالفت تو ایک طرف، وہ ذرا سے اختلاف کو بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ یہ جو ہم روز سنتے اور دیکھتے ہیں کہ تاش کھیلتے ہوئے دو دوست آپس میں گتھم گتھا ہو گئے۔ چار پیسے کے سودے پر دوکاندار نے گاہک کا سر پھوڑ دیا۔ دو آنے پر جھگڑا ہوا اور ایک نے دوسرے کے چھرا گھونپ دیا۔ سالن میں ذرا نمک زیادہ ہوا تو بیوی کو طلاق دے دی۔ بچہ رویا تو اسے اٹھا کر زمین پر پٹک دیا۔ یہ سب اسی قومی چڑچڑا پن کے مظاہرے ہیں۔

یہ صورت "دنیاوی کاروبار" میں ہے۔ مذہبی معاملات میں حالت اس سے بھی نازک تر ہے۔ ہمارے ہاں شاید ہی کوئی دن گذرتا ہو جب اس قسم کی خبریں نہ آتی ہوں کہ فلاں مسجد میں کسی نے جماعت میں اونچی آواز سے آمین کہہ دی اور سر پھٹول ہوگئی۔ کسی نے ہاتھ سینے پر باندھ لئے تو فساد برپا ہوگیا۔ کسی نے تشہد میں شہادت کی انگلی اٹھا دی تو اس کی انگلی توڑ دی گئی۔ کسی نے کسی پیر صاحب کی نیاز دے دی تو ہنگامہ برپا ہوگیا۔ کسی نے کہہ دیا کہ قبروں پر منتیں ماننا جائز نہیں تو خون خرابہ ہوگیا۔ وغیرہ وغیرہ۔ اسی اختلاف کا نتیجہ ہے کہ مختلف فرقوں کی مسجدیں الگ ہیں۔ ان کی تولیت کے مسئلہ پر باہمی فسادات ہوتے ہیں۔ پولیس کو مداخلت کرنی پڑتی ہے۔ مسجدوں میں تالے پڑ جاتے ہیں۔ معاملہ عدالتوں تک جاتا ہے۔ باہمی مقدمہ بازی ہوتی ہے۔ مقدمہ بازی سے فریقین میں عداوت اور انتقام کے جذبات اور تیز ہوتے ہیں۔ اور امت میں اختلاف اور افتراق کی خلیج وسیع سے وسیع تر ہوتی چلی جاتی ہے۔

ہماری اس شعلہ مزاجی سے، علاوہ اس کے کہ ہمارے اندر فتنہ و فساد، اور باہمی بغض و عداوت کی آگ مسلسل سلگتی اور اکثر و بیشتر بھڑکتی رہتی ہے، ایک سخت نقصان یہ بھی ہوا ہے کہ ہمارا کوئی اختلافی مسئلہ آج تک سلجھ ہی نہیں سکا۔ اس لئے کہ ان مسائل کو سلجھانے کے لئے ضروری ہے کہ ان کے متعلق نہایت متانت اور سنجیدگی سے گفتگو کی جائے۔ ان پر ٹھنڈے دل سے غور و فکر کیا جائے۔ فریق مخالف پر شروع ہی میں جھپٹ پڑنے کے بجائے اس کے نقطۂ نگاہ کو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ پھر اپنے موقف کو دلائل و براہین اور اسناد و شہادات کی تائید سے، باوقار طریق سے پیش کیا جائے۔ اور یہ کچھ کہنے اور سننے میں، جوش اور غصے کو پاس تک نہ آنے دیا جائے۔ یعنی اس سارے معاملہ میں "حلیم الطبع" رہا جائے۔ لیکن بدقسمتی سے ہمارے ہاں یہ چیز مفقود ہے۔ اب اختلافی مسائل کا تصفیہ علم و برہان کی رو سے نہیں کیا جاتا، پراپیگنڈہ کے زور سے کیا جاتا ہے۔ اس میں معاملہ طعن و تشنیع یا پھبتیوں اور گالیوں تک ہی نہیں رہتا بلکہ فریق مقابل کے خلاف جھوٹے الزام لگائے جاتے ہیں۔ تہمتیں تراشی جاتی ہیں۔ افترا باندھے جاتے ہیں۔ جو کچھ اس نے کبھی نہیں کہا، اس کا اسے مجرم قرار دیا جاتا ہے۔ اور اس طرح لوگوں کو باور یہ کرایا جاتا ہے کہ ہم نے حق کا بول بالا کر دیا۔

آپ سوچئے کہ ان حالات میں کسی مسئلہ کا بھی، علم و بصیرت اور حق و انصاف کے مطابق فیصلہ ہو سکتا ہے؟ یہی وجہ ہے کہ قوم کا بڑا قیمتی وقت۔ بے شمار دولت اور لامحدود توانائیاں انہی باتوں پر صرف ہو رہی ہیں، اور باہمی اختلافات کی خلیج عمیق سے عمیق تر اور عداوت و نفرت کی آگ تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی ہے۔

کس قدر خون کے آنسو رلا دینے والے ہیں ہمارے یہ حالات!

پاکستان کا خطۂ زمین اس لئے حاصل کیا گیا تھا کہ یہاں صحیح اسلامی نظام قائم ہو۔ ظاہر ہے کہ صحیح اسلامی نظام اُس کو کہا جائے گا جس میں صحیح اسلامی قوانین نافذ ہوں۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلا اور بنیادی سوال یہ تھا کہ مملکت کے قوانین کی بنیاد کیا ہونی چاہیئے۔ ہماری تاریخ میں صحیح اسلامی نظام، عہد محمد رسول اللہ والذین معہٗ میں قائم ہوا تھا۔ اس دور بہاریوں کے متعلق (کم از کم) ایک بات ایسی ہے جس میں کسی کو بھی اختلاف نہیں ہو سکتا۔ اور وہ یہ کہ اُس میں تمام مسلمانوں پر ایک ہی قانون نافذ تھا۔ مختلف فرقوں کے مختلف قوانین نہیں تھے ـــــ اس دور میں مسلمانوں میں مختلف فرقے تھے ہی نہیں۔ فرقوں کا وجود بہت بعد کی پیداوار ہے۔ لیکن اُس دور کے بعد مسلمانوں کی جس قدر حکومتیں بھی قائم ہوئیں، ان میں صورت یہی رہی کہ جس فرقہ کی حکومت تھی اس کی فقہ ملک کا قانون تھی، حالانکہ دوسرے فرقے اس فقہ کو اسلامی قانون تسلیم نہیں کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ اگر صحیح اسلامی نظام وہی تھا جو عہد محمد رسول اللہ والذین معہٗ میں قائم ہوا تھا (اور اس کے صحیح اسلامی ہونے میں شبہ کیسے ہو سکتا ہے؟) تو وہ نظام جس میں کسی ایک فرقہ کا قانون نافذ ہو، دوسرے فرقوں کے نزدیک اسلامی نہیں کہلا سکتا۔ ہم چاہتے یہ تھے کہ پاکستان میں پھر سے وہی نظام قائم ہو جو عہد محمد رسول اللہ والذین معہٗ میں قائم تھا ـــ یعنی اس میں نہ مختلف فرقوں کے لئے الگ الگ قوانین ہوں۔ نہ کسی خاص فرقے کا قانون سب پر نافذ ہو، بلکہ تمام امت ایک ہی ضابطہ قوانین کے تابع زندگی بسر کرے۔ ہمیں اس کا احساس ہے کہ یہ تبدیلی ایک دن میں نہیں ہو سکتی۔ لیکن یہ تو ہو سکتا ہے کہ اس کے لئے راستہ ایسا اختیار کیا جائے جو ہمیں بالآخر اس منزل تک پہنچا دے۔

ملک میں ایک ایسا گروہ موجود تھا (اور اب تک موجود ہے) جو کہتا تھا کہ ملک میں واحد قانون کا نفاذ صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ نظام حکومت سیکولر ہو اور مختلف فرقوں کو آزادی ہو کہ وہ عبادات اور پرسنل لاز میں اپنے اپنے طریق پر عمل کر لیا کریں۔ ظاہر ہے کہ یہ نظام، جو اسلام کو جڑ بنیاد سے اکھیڑ دیتا ہے، ہمارے لئے کبھی قابلِ قبول نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لئے ہم نے اس کی سخت مخالفت کی ـــ اور ہم اس کی ہمیشہ مخالفت کریں گے ـــ اُن لوگوں کی طرف سے چیلنج یہ دیا گیا کہ اگر یہ نظام قابلِ قبول نہیں تو قانون کی ایسی بنیاد بتاؤ جو تمام مسلمانوں کے نزدیک متفق علیہ ہو۔ یہ سوال بڑا

بنیادی اور اہم تھا۔۔۔ ملک میں قابل عمل نظام کس قسم کا ہوگا' اسی سوال کے جواب پر موقوف تھا۔ ظاہر ہے کہ اگر قانون کی ایسی بنیاد نہ بنائی جا سکے جو تمام مسلمانوں کے نزدیک متفق علیہ ہو' تو پھر ایسا قانون بن ہی نہیں سکتا جسے تمام مسلمان متفقہ طور پر اسلامی قانون تسلیم کر لیں۔

اس کے جواب میں یہ کہا گیا کہ ہمارے قانون کی بنیاد "کتاب و سنت" ہونی چاہیئے۔ اور اس کی تائید میں یہ کہا گیا کہ اس مطالبہ پر تمام مختلف فرقے متفق ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس مطالبہ میں مختلف فرقے متفق ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اس مطالبہ کے مطابق کوئی ایسا ضابطۂ قوانین موجود ہے (یا بن سکتا ہے) جسے تمام فرقے متفقہ طور پر اسلامی قانون تسلیم کرتے ہوں؟ ظاہر ہے کہ یہ سوال محض نظری نہیں ایک عملی سوال ہے۔ اور اس کا عملی جواب ہر ایک کے سامنے ہے۔ اور وہ یہ کہ ہر فرقے کا قانون الگ الگ ہے۔

(۱) ان کی عبادات کے طریق میں اختلاف ہے۔

(۲) ان کے شخصی قوانین (پرسنل لاز) مختلف ہیں۔

(۳) ان کی فقہ الگ الگ ہے۔

حالانکہ یہ سب فرقے اس کا دعوےٰ کرتے ہیں کہ ان کا مسلک 'سنت رسول اللہ' کے مطابق ہے۔ ان کے اس باہمی اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ ہر فرقے کی "سنت رسول اللہ" الگ الگ ہے۔ تمام فرقوں کے نزدیک 'سنت رسول اللہ کی عملی شکل کا ایک ہونا تو در کنار' ان کا اس باب میں بھی اتفاق نہیں کہ "سنت رسول اللہ" کہتے کسے ہیں؟ یہ بات اکثر حضرات کے لئے شاید حیران کن ہو' لیکن یہ ہے حقیقت پر مبنی۔ آپ کو یاد ہوگا کہ کچھ عرصہ ہوا' اہلسنت والجماعت کے دو گروہوں میں اس مسئلہ پر بحث چھڑی تھی۔ ایک طرف سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی اور امین احسن صاحب اصلاحی تھے۔ اور دوسری طرف' جمعیت اہل حدیث کے معتمد' مولانا محمد اسمٰعیل صاحب۔ مؤخر الذکر مولانا صاحب نے اس بحث کو ایک کتابچہ کی شکل میں شائع کیا تھا جس کا نام ہے "جماعت اسلامی کا نظریۂ حدیث" وہ اس میں "سنت" کی اس تعریف کے متعلق جو مولانا اصلاحی نے پیش فرمائی تھی' لکھتے ہیں:

> مولانا کی یہ تعریف منطقی ہے نہ عرفی۔۔۔۔۔۔ وہ اس مفہوم میں پوری امت سے مختلف ہیں۔۔۔۔۔
> ہزار دفعہ فرمایا جائے کہ " اگر کوئی شخص اس (سنت) کو ماخذ دین تسلیم نہیں کرتا تو میں اس کو مسلمان تسلیم نہیں کرتا" سوال یہ ہے کہ اس سنت کی پہنائی ہے کہاں تک؟ اس کا احاطہ چند اعمال سے آگے نہیں بڑھے گا۔ پورا اسلام تو کسی دوسری جگہ ہی سے ثابت کرنا ہوگا (صفحہ ۳۵-۳۶)۔

آگے چل کر مودودی صاحب اور اصلاحی صاحب دونوں کے متعلق لکھا ہے:

میری رائے میں ان کے نظریات نہ صرف مسلک اہل حدیث کے خلاف ہیں بلکہ یہ نظریات تمام ائمہ اہل حدیث کے خلاف ہیں۔ ان میں آج کے جدید اعتزال وتجہم کے جراثیم مخفی ہیں۔ (صفحہ ۱۱)

حتیٰ کہ انہوں نے "مولانا شبلی مرحوم ـــــ مولانا حمید الدین فراہیؒ ۔ مولانا ابو الاعلیٰ مودودی ۔ مولانا امین احسن اصلاحی ۔ اور عام فرزندانِ ندوہ باستثنائے حضرت سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق لکھا تھا کہ

> یہ حضرات حدیث کے منکر نہیں لیکن ان کے انداز فکر سے حدیث کا استخفاف اور استحقار معلوم ہوتا ہے۔ اور طریقہ گفتگو سے انکار کے لئے چور دروازے کھل سکتے ہیں۔ (صفحہ ۴۰)

چونکہ طلوع اسلام میں، اس سے پہلے، اس باب میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، اس لئے ہم مزید تفصیل میں جانا تحصیل حاصل سمجھتے ہیں۔ اس سے مقصود صرف یہ بتانا تھا کہ جن حضرات کی طرف سے "کتاب وسنت" پر مبنی قانون کا مطالبہ پیش کیا گیا ہے ان کا اس باب میں بھی اتفاق نہیں کہ "سنت" کہتے کسے ہیں، چہ جائیکہ ان کے ہاں کوئی ایسا ضابطہ قوانین موجود ہو جسے سب، بلا اختلاف، اسلامی قوانین تسلیم کرتے ہوں۔

اس کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر اس وقت کوئی ایسا ضابطہ قوانین موجود نہیں جسے مختلف فرقوں کے مسلمان متفقہ طور پر اسلامی قانون تسلیم کریں، تو کیا ایسا ممکن ہے کہ "کتاب وسنت" پر مبنی ایسا ضابطہ قوانین مرتب کر لیا جائے جسے تمام فرقے اسلامی قانون تسلیم کر لیں! اس کا جواب بھی اتفاق سے ہمارے سامنے آگیا ہے۔ مولانا مودودی صاحب سے یہی سوال کسی نے دریافت کیا تو انہوں نے اس کا جواب "ترجمان القرآن" کی دسمبر ۱۹۸۶ء کی اشاعت میں شائع فرما دیا۔ وہ جواب یہ ہے

> مسلمانوں میں فرقوں کے جس قدر اختلافات ہیں ان کے بارے میں پہلے ہی پاکستان کے علماء اس بات پر اتفاق کر چکے ہیں کہ جہاں تک پرسنل لا کا تعلق ہے ہر فرقے پر وہی احکام نافذ ہوں گے جو اس فرقے کے نزدیک مسلّم ہیں۔ اور جہاں تک ملکی قوانین کا تعلق ہے وہ اکثریت کے مسلک کے مطابق ہوں گے۔
>
> کیا اس کے بعد وہ مشکلات باقی رہتی ہیں جن کا حوالہ دیا جاتا ہے؛ اگر مجلس قانون ساز میں جانے والے نمائندے احتیاط کے ساتھ اس اصول پر عمل کریں تو فرقہ وارانہ اختلافات آہستہ آہستہ کم ہوتے چلے جائیں گے اور ہمارے قوانین کا ارتقاء بڑی اچھی طرح ہو سکے گا۔

اسی جواب کی اگلی شق یہ ہے۔

فقہ جعفری اور شیعہ علماء کا اجتہاد اسی ملک میں نافذ کیا جا سکتا ہے جہاں شیعہ فرقہ کی اکثریت ہو۔ چنانچہ ایران میں وہ نافذ ہے۔ لیکن پاکستان میں وہ شیعوں کے پرسنل لاء کی حیثیت سے ہی رہ سکتا ہے۔ سُنّی اکثریت پر اس کو نافذ کرنے کی کیسے کوشش کی جا سکتی ہے۔

(ترجمان القرآن - دسمبر ۱۹۶۱ء صفحہ ۱۸۸)

آپ نے غور فرمایا کہ یہ بعینہٖ وہی پوزیشن ہے جسے ہم شروع میں بیان کر چکے ہیں۔ یعنی یہ کہ "کتاب وسنت" کو بنیاد قرار دینے سے ایسا ضابطۂ قوانین مرتب نہیں کیا جا سکتا جو مسلمانوں کے تمام فرقوں کے نزدیک متفقہ طور پر اسلامی قانون کہلا سکے۔ پاکستان میں اکثریت حنفیوں کی ہے۔ اس لئے یہاں حنفی فقہ، اسلامی قانون کی حیثیت لے گی (ایران میں شیعوں کی اکثریت ہے اس لئے وہاں فقہ جعفری، اسلامی قانون کی حیثیت اختیار کرے گی) سوال یہ ہے کہ کیا پاکستان میں غیر حنفی مسلمان، فقہ حنفی کو مطابق "کتاب وسنت" تسلیم کرتے ہیں؟

غیر حنفی تو ایک طرف، خود مودودی صاحب، جن کی طرف سے یہ تجویز پیش ہوئی ہے، فقہ حنفی کے متعلق لکھتے ہیں کہ۔

امام ابو حنیفہؒ کی فقہ میں آپ بکثرت ایسے مسائل دیکھیں گے جو مرسل اور معضل اور منقطع احادیث پر مبنی ہیں یا جن میں ایک قوی الاسناد حدیث کو چھوڑ کر ضعیف الاسناد کو قبول کر لیا گیا ہے۔ یا جن میں احادیث کچھ کہتی ہیں اور امام ابو حنیفہؒ اور ان کے اصحاب کچھ کہتے ہیں۔

(رسائل ومسائل۔ صفحہ ۲۷۴ - ۲۷۵)

اسی کتاب میں دوسری جگہ لکھتے ہیں۔

نماز جمعہ میں شرط مصر کے متعلق مجھے عام علمائے حنفیہ سے اختلاف ہے۔ (ایضاً صفحہ ۱۴۲)

۱۹۵۵ء میں، عائلی کمیشن نے سوال نامہ جاری کیا۔ اس میں ایک سوال طلاق کے شرعی طریق سے بھی متعلق تھا۔ اس کے جواب میں مودودی صاحب نے لکھا تھا

ائمۂ اربعہ اور جمہور فقہا کا مسلک یہ ہے کہ تین طلاق اگر یک وقت دیئے جائیں تو وہ تین ہی طلاق شمار ہوں گے۔ اور میرے نزدیک یہی صحیح تر ہے۔ اس لئے میں یہ مشورہ نہیں دے سکتا کہ اس قاعدے میں کوئی تغیر کیا جائے۔ لیکن یہ امر مسلم ہے کہ ایسا کرنا گناہ ہے کیونکہ یہ اس صحیح طریقہ کے خلاف ہے جو اللہ اور اس کے رسول نے طلاق دینے کے لئے سکھایا ہے اس لئے اس غلط طریقے کی روک تھام ضروری ہونی چاہیئے[1] میری رائے میں اس غرض کے لئے حسب ذیل تدابیر مناسب ہوں گی۔

[1] آپ اس وقت اس سوال کو چھوڑ دیجئے کہ مودودی صاحب کے نزدیک جو طریق خدا اور رسول کا سکھائے ہوئے طریق کے خلاف ہے۔ اور اسکے
سلسلہ صفحہ

الف ۔ مسلمانوں کو عام طور پر طلاق کے صحیح طریقے سے واقف کرایا جائے ۔ اس کی حکمتیں اور اس کے فوائد سمجھائے جائیں ۔ اس کے مقابلے میں طلاق بدعی کے نقصانات سے آگاہ کیا جائے نیز یہ بھی بتایا جائے کہ اس غلط طریق سے طلاق دینے والا گناہگار ہوتا ہے ۔ یہ چیز تعلیم کے نصاب میں بھی شامل ہونی چاہیئے ۔ ریڈیو اور پریس کے ذریعہ سے بھی نشر ہونی چاہیئے اور نکاحناموں کے ساتھ جو احکام منسلک ہوں ان میں بھی اسے درج ہونا چاہیئے ۔

(ب) دستاویز نویسیوں کو حکماً تین طلاق کی دستاویز لکھنے سے منع کر دیا جائے ۔ اور خلاف ورزی کرنے والوں کے لئے جرمانہ مقرر کیا جائے ۔

(ج) بیک وقت تین طلاق دینے والوں کے لئے بھی سزا یا جرمانہ مقرر کر دی جائے ۔

یہ ہیں فقہ حنفی کے متعلق خود مودودی صاحب کے تأثرات ـــــ صرف فقہ حنفی کے متعلق ہی نہیں بلکہ ایک ایسے مسئلہ کے متعلق جو "ائمۂ اربعہ اور جمہور فقہاء" کے نزدیک متفق علیہ ہے ۔ اس سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ غیر حنفی مسلمان' اس فقہ کو کس طرح ملک کا اسلامی قانون تسلیم کر لیں گے ؟

واضح رہے کہ ہم نے فقہ حنفی کا نام اس لئے لیا ہے کہ مودودی صاحب نے اسے ملک کا قانون بنانے کی تجویز پیش فرمائی ہے ۔ ورنہ جہاں تک اصل سوال کا تعلق ہے' اس میں کسی فقہ کی بھی تخصیص نہیں ۔ آپ کسی فرقے کی فقہ کو ملک کا قانون بنا دیجئے' دوسرے فرقوں والے اسے اسلامی قانون تسلیم نہیں کریں گے ۔ ظاہر ہے کہ جب پرسنل لاء میں ایک فرقہ' دوسرے فرقہ کے قوانین کو اپنے لئے قابلِ قبول تسلیم نہیں کرتا تو ملکی قانون میں' ایک فرقہ دوسرے فرقے کے قانون کو کس طرح اسلامی تسلیم کرے گا!

ضمناً یہ چیز بجائے خویش غور طلب ہے کہ پرسنل لاء اور ملکی قانون کی تفریق' کس طرح "کتاب و سنت" کے مطابق ہے؟ کیا اللہ کی کتاب ان دونوں میں فرق کرتی ہے ؟ اور کیا نبی اکرمؐ کے عہد مبارک میں' ان دونوں میں تفریق تھی ؟

تصریحاتِ بالا سے واضح ہے کہ ان حضرات کو خود تسلیم ہے کہ اب اس قسم کا اسلامی نظام دوبارہ قائم نہیں ہو سکتا جس قسم کا نظام عہد محمد رسول اللہؐ والذین معہٗ میں قائم ہوا تھا اور جس میں تمام مسلمانوں پر ایک ہی

(صفحہ ۷ کا بقیہ فٹ نوٹ) مطابق طلاق دینا گناہ ہے' وہ اسے "صحیح تر" بھی قرار دیتے ہیں اور اس کی روک تھام کے لئے تدابیر بھی تجویز کرتے ہیں!

قانون نافذ ہوتا تھا۔

طلوعِ اسلام کا ایمان یہ ہے کہ صحیح اسلامی نظام وہی تھا جو اس عہدِ سعادت عہد میں قائم ہوا تھا۔ اور وہ نظام پھر سے قائم ہو سکتا ہے۔ (اسی کو خلافت علیٰ منہاجِ نبوت کہتے ہیں جس کی طرف طلوعِ اسلام شروع سے دعوت دیتا چلا آ رہا ہے)۔ اس کی عملی شکل اس نے حسبِ ذیل تجویز کی تھی۔

"کتاب و سنت" کے دو جزو ہیں۔ ایک کتاب (قرآن) اور دوسرا "سنت"۔ قرآن کریم وہ کتاب ہے جسے تمام فرقوں کے مسلمان حرفاً حرفاً خدا کی کتاب تسلیم کرتے ہیں۔ اس میں کسی کو اختلاف نہیں۔ "سنت" کی کتابیں (یعنی احادیث کے مجموعے) ہر فرقے کے اپنے اپنے ہیں۔ جو مجموعے بعض فرقوں میں مشترک ہیں، ان کی مختلف حدیثوں کے متعلق اختلاف ہے۔ جو ایک کے نزدیک صحیح ہیں وہ دوسرے کے نزدیک صحیح نہیں۔ ہر فرقہ کی فقہ انہی احادیث پر متفرع ہے جو اس کے نزدیک قابلِ اعتماد ہیں۔ اسی وجہ سے ہر فرقہ کی فقہ بھی الگ الگ ہے۔ آپ دیکھئے کہ ان تمام چیزوں میں اگر کوئی چیز ایسی ہے جو تمام مسلمانوں کے نزدیک متفق علیہ ہے تو وہ قرآن کریم ہے (اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اس کی حفاظت کا ذمہ خود لیا تھا)۔ طلوعِ اسلام نے کہا یہ تھا کہ

(۱) قرآن کریم کو قانون کی بنیاد تسلیم کر لیا جائے۔

(۲) مختلف فرقوں کی فقہ اور احادیث کا جائزہ قرآن کریم کی روشنی میں لیا جائے۔ ان میں اگر کوئی بات قرآن کے خلاف نظر آئے اسے مسترد کر دیا جائے۔

(۳) باقی چیزوں میں سے جو کچھ ہماری موجودہ ضروریات کو پورا کرتا ہو اسے اسی طرح رکھ لیا جائے۔ جس میں کسی تبدیلی کی ضرورت ہو، اس میں ضروری تبدیلی کر دی جائے۔ اور جہاں ضرورت ہو، نیا قانون بنا لیا جائے۔

(۴) یہ سب کام، اُمت کے نمائندگان، ارباب علم و بصیرت کے مشورہ سے طے پائے۔

(۵) اور جو کچھ طے پائے، اسے مملکت کے قانون کی حیثیت سے نافذ کر دیا جائے۔

ہم اربابِ فہم و بصیرت، اور اصحابِ سنجیدگی و متانت سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ طلوعِ اسلام کی طرف سے پیش کردہ تجویز میں کوئی بات ایسی ہے جو دین کے خلاف ہو جس میں سوءِ ادبی یا گستاخی پائی جائے یا جو کسی صاحبِ ہوش کے لئے غم و غصہ کا موجب ہو؟ لیکن آپ یہ معلوم کر کے حیران ہوں گے کہ اس پر غیظ و غضب کا طوفان برپا کر دیا گیا۔ پراپیگنڈہ کی پوری مشینری حرکت میں لائی گئی۔ ہر طرف سے شور بلند کر دیا گیا کہ یہ بہت بڑا فتنہ ہے۔ یہ انکارِ حدیث ہے۔ انکارِ سنت ہے۔ (معاذ اللہ) منصبِ رسالت کا انکار ہے۔ حضورؐ کی شانِ اقدس میں (ربنا و سجدا۔ توبہ، توبہ) گستاخی ہے۔ یہ الحاد ہے۔ بے دینی ہے۔ کفر ہے اور معلوم کیا کیا ہے۔ اس پر بھی جی نہ بھرا تو اس قسم کے الزامات تراشنے

شروع کر دیئے کہ یہ ایک نیا مذہب ایجاد کرنا چاہتے ہیں۔ یہ اسلامی شعائر اور ارکان کی (خاکم بدہن) توہین کرتے ہیں۔ یہ قرآن کے روزوں کے قائل ہیں۔ یہ تین نمازیں پڑھتے ہیں ـــــ ہر نماز کی ایک رکعت، اور ہر رکعت میں ایک سجدہ ـــــ اس سے بھی آگے بڑھے تو یہ مشہور کرنا شروع کر دیا کہ یہ غلام محمد (گورنر جنرل مرحوم) کو (معاذ اللہ) "خدا اور رسول" کا مقام دیتے ہیں۔ یہ سکندر مرزا کی اطاعت کو (پناہ بخدا) "کتاب وسنت" کی اطاعت کہتے ہیں۔ یہ ہر فاسق وفاجر حکومت کو اسلامی حکومت قرار دیتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ کامل تیرہ برس ہونے کو آئے کہ پراپیگنڈہ کا یہ دریائے پرشور اپنی انتہائی طغیانیوں کے ساتھ جاری ہے۔ اور ہم چلا چلا کر کہہ رہے ہیں کہ ہم ان میں سے کوئی بات بھی نہیں کہتے۔ یہ سب ہمارے خلاف افترا پردازی ہے۔ لیکن وہ، اس کے باوجود، ان الزامات کو برابر دُہرائے چلے جاتے ہیں، اور، اس خیال سے کہ ان کے سننے والے حقیقتِ حال سے باخبر نہ ہو جائیں، انہیں تاکید کرتے رہتے ہیں کہ ان کا کوئی لٹریچر نہ پڑھے۔ کوئی ان کی بات نہ سنے۔ جو ایسا کرے گا اس کا ایمان ضائع ہو جائے گا۔

ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہئے؟

آپ سمجھتے ہیں کہ ایسی فضا میں، کسی علمی یا دینی سوال پر متانت اور سنجیدگی سے غور کیا جا سکتا ہے، اور کسی معاملہ کا ٹھنڈے دل سے حل تلاش کیا جا سکتا ہے؟ آپ سوچئے کہ جس مقصد کے لئے یہ سوال اٹھایا گیا تھا وہ کس قدر اہم تھا، اور اہم ہے۔ لیکن اس تیرہ برس کے عرصہ میں جو ہزارہا صفحات لکھے گئے اور جو لاکھوں تقریریں ہوئیں، کیا ان سے ہم ذرا بھی اس سوال کے قریب پہنچ سکے کہ پاکستان میں ایسے قوانین کس طرح مرتب کئے جائیں جو تمام مسلمانوں کے نزدیک متفقہ طور پر اسلامی ہوں! ہم حیران ہیں کہ اگر آخر الامر یہی کہنا تھا جو اب کہا جا رہا ہے، تو اس کے لئے اس قدر ہنگامہ آرائی کی ضرورت کیا تھی؟ اس سوال کا سیدھا سادہ جواب یہ تھا کہ

(۱) اب کوئی ایسا قانون نہیں بنایا جا سکتا جسے تمام مسلمان متفقہ طور پر اسلامی قانون تسلیم کر لیں۔

(۲) اب مسلمان، ملتِ واحدہ نہیں بن سکتے۔

(۳) اب وہ نظام قائم نہیں کیا جا سکتا جو عہدِ محمد رسول اللہ والذین معہٗ میں قائم تھا۔

(۴) اب ہر فرقہ کے پرسنل لاز الگ الگ ہوں گے۔ اور ملک کا قانون، اکثریت کی فقہ ہوگی، خواہ اسے دوسرے فرقے "کتاب وسنت" کے مطابق تسلیم ہی کریں۔

جہاں تک اس سلسلہ میں، کچھ نہیں کہنا چاہتے، بجز اس کے کہ قرآن کریم کی چند آیات، بلا تفسیر و تشریح درج کر دیں تاکہ وہ لوگ جن کا اس کتابِ عظیم پر ایمان ہے، خود فیصلہ کر لیں کہ خدائے تعالیٰ کا اس باب میں کیا ارشاد ہے۔

قرآن کریم میں ہے۔

(١) وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا .... تَهْتَدُوْنَ (٣/١٠٣)۔

اے ایمان والو! تم سب مل کر اللہ کی رسی (قرآن) کو مضبوطی سے تھام لو اور تفرقہ مت پیدا کرو۔ اور اللہ کی اس نعمت کو یاد کرو جو اس نے تم پر کی جبکہ تم آپس میں دشمن تھے۔ سو اس نے تمہارے دلوں میں باہمی الفت ڈال دی اور اس کے فضل سے تم آپس میں بھائی بھائی بن گئے۔ تم آگ کے ایک گڑھے کے کنارے پر تھے۔ اس نے تمہیں اس سے بچا لیا۔ اللہ اس طرح اپنی آیات کو تم سے واضح طور پر بیان کرتا ہے تاکہ تم سیدھی راہ پا سکو۔

(٢) وَلَا تَكُوْنُوْا .... عَذَابٌ عَظِيْمٌ۔ (٣/١٠٥)

اور تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جو فرقوں میں بٹ گئے اور انہوں نے باہمی اختلاف کیا، بعد اس کے کہ ان کے پاس (خدا کے) واضح احکام پہنچ گئے تھے۔ ان کے لئے سخت عذاب ہے۔

(٣) اِنَّ الَّذِيْنَ .... لَسْتَ مِنْهُمْ فِيْ شَيْءٍ (٦/١٦٠)

(اے رسول!) جو لوگ اپنے دین میں تفرقہ پیدا کریں اور گروہ بن جائیں، تجھے ان سے کچھ سروکار نہیں۔

(٤) وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ .... فَرِحُوْنَ (٣٠/٣١-٣٢)

اور اقامتِ صلوٰۃ کرو۔ اور مشرکین میں سے نہ ہو جاؤ۔ یعنی ان لوگوں میں سے جنہوں نے اپنے دین میں پھوٹ ڈال دی اور ان میں بہت سے فرقے ہو گئے۔ پھر ہر فرقہ اس میں مگن ہے جو اس کے پاس ہے۔

(٥) وَمَا اخْتَلَفْتُمْ .... اِلَى اللّٰهِ (٤٢/١٠)

اور جس بات میں بھی تم میں اختلاف ہو اس کا فیصلہ خدا کی طرف سے رہا ہو۔

(٦) اَفَغَيْرَ اللّٰهِ .... وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (٦/١١٤-١١٥)

کیا میں اللہ کے سوا کوئی اور فیصلہ کرنے والا تلاش کروں، حالانکہ اس نے تمہاری طرف واضح کتاب نازل کر دی ہے۔ اور جن کو ہم نے وہ کتاب دی ہے وہ جانتے ہیں کہ وہ تیرے رب کی طرف سے حق کے ساتھ اتاری گئی ہے۔ سو تو جھگڑنے والوں میں سے نہ ہو۔

تیرے رب کی بات، صدق اور عدل کے ساتھ تکمیل تک پہنچ گئی ہے۔ اس کی باتوں کو کوئی بدلنے والا نہیں۔ وہ سننے والا جاننے والا ہے۔

(۹) وَمَنْ لَّمْ ..... كَافِرُوْنَ (۵/۴۴)

سو جو بھی اللہ کی کتاب کے مطابق فیصلہ نہ کرے، تو یہی لوگ ہیں جو کافر ہیں۔

یہ آیات جلیلہ پکار پکار کر کہہ رہی ہیں کہ

(i) اسلام وحدتِ امت کا نام ہے۔ جب امت میں اختلاف ہونے سے فرقے پیدا ہو جائیں تو وہ اسلامی زندگی نہیں کہلا سکتی۔

(ii) اختلافات مٹانے کا طریقہ یہ ہے کہ ہر اختلافی معاملہ کا حل، خدا کی کتاب سے لیا جائے۔ وہ آیا ہی اس لئے ہے کہ دنیا کے اختلافات مٹا دے۔

(iii) جو لوگ اسے اپنا حکم تسلیم نہیں کرتے وہ مومن نہیں، کافر ہیں۔

اس ضمن میں یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ اگر سنت کے متعلق اختلافات ہیں، تو قرآن کریم کی تعبیر میں بھی تو مختلف فرقوں میں اختلاف ہے۔ یہ ٹھیک ہے۔ لیکن دیکھئے کہ دونوں میں فرق کیا ہے۔

(i) قرآن کریم کے متن میں کسی کو اختلاف نہیں۔ یعنی جب کسی کے سامنے قرآن کریم کی کوئی آیت پیش کی جائے تو وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں اسے قرآن کی آیت نہیں تسلیم کرتا۔ اس کے برعکس،

کوئی روایت جو رسول اللہؐ کی طرف منسوب ہو، اس کی نسبت کا صحیح اور معتبر ہونا بجائے خود زیرِ بحث ہوتا ہے۔ (سید ابوالاعلیٰ مودودی۔ رسائل و مسائل۔ صفحہ ۲۹۰)

یعنی روایات کے سلسلہ میں یہی بات فیصلہ طلب ہوتی ہے کہ وہ رسول اللہؐ کی ہے بھی یا نہیں۔ یہ اختلاف کس قسم کا ہوتا ہے، اس کے متعلق بھی مودودی صاحب ہی کے الفاظ میں سنئے۔ وہ فرماتے ہیں۔

آپ کے نزدیک ہر اس روایت کو حدیثِ رسولؐ مان لینا ضروری ہے جسے محدثین سند کے اعتبار سے صحیح قرار دیں لیکن ہمارے نزدیک یہ ضروری نہیں ہے۔ ہم سند کی صحت کو حدیث کے صحیح ہونے کی لازمی دلیل نہیں سمجھتے۔ ہمارے نزدیک سند کسی حدیث کی صحت معلوم کرنے کا واحد ذریعہ نہیں ہے بلکہ وہ ان ذرائع میں سے ایک ہے جن سے کسی روایت کے حدیثِ رسولؐ ہونے کا ظنِ غالب حاصل ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ہم یہ بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ متن پر غور کیا جائے۔ قرآن و حدیث کے مجموعی علم سے دین کا جو فہم ہمیں حاصل ہوا ہے اس کا لحاظ بھی کیا جائے۔ اور حدیث کی وہ مخصوص روایت جس معاملہ سے متعلق ہے اس معاملہ میں قوی تر ذرائع سے جو سنتِ ثابتہ ہمیں معلوم ہو اس پر بھی نظر ڈالی جائے۔ علاوہ بریں اور بھی متعدد پہلو ہیں جن کا

لحاظ کئے بغیر ہم کسی حدیث کی نسبت نبی صلعم کی طرف کر دینا مناسب نہیں سمجھتے۔

(رسائل و مسائل از مودودی صاحب صفحہ ۲۹۰)

(۲) آیاتِ قرآنی کی تعبیریں اس لئے مختلف ہوتی ہیں کہ ہر فرقہ آیت کی تعبیر اس روایت کی رو سے کرتا ہے جسے وہ صحیح سمجھتا ہے۔ اور چونکہ ہر فرقہ کی روایات مختلف ہیں، اس لئے ان کی رو سے قرآنی آیات کی تعبیریں بھی اختلاف ہوتا ہے۔ بالفاظِ دیگر قرآن کریم کو ان روایات کے تابع رکھا جاتا ہے۔ اگر قرآن کریم کو اوپر رکھا جائے، اور روایات کو اس کے تابع، اور اس طرح ارباب علم و بصیرت کے باہمی مشورہ سے، اجتماعی طور پر، قرآن کریم کی آیات کو سمجھنے کی کوشش کی جائے تو اختلاف پیدا ہو نہیں سکتا۔ اس لئے کہ قرآن کریم کا دعویٰ یہ ہے کہ

وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا (۴/۸۲)

"اگر یہ قرآن اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا، تو اس میں بہت اختلاف پاتے۔

(۳) ایک چیز یہ ہے کہ لوگ قرآنی آیات کی تعبیر اپنی اپنی منشاء کے مطابق کریں۔ اور دوسری یہ ہے کہ احکام و قوانین سے متعلق قرآن کی آیات (معاذ اللہ) ہوں ہی ایسی کہ وہ موافق اور مخالف دونوں کی تائید کر دیں۔ اگر ہم یہ مان لیں کہ قرآن کریم کی آیات مخالف، موافق دونوں کی تائید کر دیتی ہیں، تو کہیئے کہ کیا ایسی کتاب (معاذ اللہ) کسی صورت میں بھی خدا کی کتاب تسلیم کی جا سکتی ہے؟ ذرا سوچئے کہ یہ تصور انسان کو کہاں پہنچا دیتا ہے۔ اس لئے ہو نہیں سکتا کہ قرآن کریم کی آیات سے متضاد احکام متعین ہو جائیں۔ تعبیر میں اختلاف اُس وقت پیدا ہوتا ہے جب ہم قرآنی آیات کو اپنے مزعومات یا معتقدات کے تابع رکھتے ہیں۔ جب ان آیات پر انفرادی طور پر نہیں بلکہ ایک نظام کے تابع غور و فکر کیا جائے گا تو اختلاف پیدا ہی نہیں ہو سکے گا۔

لیکن اگر قرآن کریم کی ان تصریحات کے باوجود، کوئی شخص اس پر مصر ہے کہ اب (معاذ اللہ) قرآن کریم میں بھی یہ صلاحیت نہیں رہی کہ وہ ہمارے اختلافات کو مٹا سکے، تو وہ اسلام کی طرف سے مایوس ہے۔ اسے اپنے لئے کوئی اور راستہ تلاش کرنا چاہیئے۔

بہرحال، یہ تھا وہ عملی سوال جس کے حل کے لئے طلوع اسلام نے اس بحث کو اٹھایا تھا۔ ہم ملک کے سنجیدہ طبقہ سے درخواست کریں گے کہ وہ ان حقائق پر ٹھنڈے دل سے غور کرے اور سوچے کہ ملک میں صحیح اسلامی نظام قائم کرنے کی کونسی صورت ممکن ہے۔ یہ سوال بڑا اہم ہے۔ اس کے حل پر نہ صرف ہماری، بلکہ ہماری آنے والی نسلوں کی "قسمت" کا بھی دار و مدار ہے۔ اگر ہم مختلف فرقوں کے اختلافات مٹا کر، ملک کے لئے

متفق علیہ اسلامی قانون نہ بنا سکے، تو ہمیں ڈر ہے کہ وہ طبقہ جو پہلے سے کہہ رہا ہے کہ ملک کے لئے متفق علیہ قانون بنانے کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ پرسنل لاز ہر فرقے کے الگ الگ ہوں اور ملک کا نظام سیکولر ہو، وہ ہمارے اختلافات کو آخری حجت کے طور پر پیش کر دے گا۔

خدا عدو کو بھی یہ خواب بد نہ دکھلائے

اس کے ساتھ ہی ہم اپنے ملائیت پرست طبقہ سے، اسلام - امت اور پاکستان کا واسطہ دے کر عرض کریں گے کہ وہ حقائق پر ٹھنڈے دل سے غور کریں اور سوچیں کہ بہ حالاتِ موجودہ، تمام ملک کے لئے واحد اسلامی قانون مرتب کرنے کی اس کے سوا کوئی اور صورت ممکن ہے کہ قرآن کریم کو قانون کی بنیاد تسلیم کیا جائے۔ یاد رکھئے! جو قانون' قرآن کریم کے مطابق ہوگا۔ وہ کبھی صحیح سنتِ رسول اللہؐ کے خلاف نہیں ہو سکتا۔ اس سے امت کے بہت سے اختلافات مٹ جائیں گے اور یہ راہ گم کردہ کاروان پھر سے اس راستے پر گامزن ہو جائے گا جو اسے اس منزل تک پہنچا دے گا جو مقصود و مطلوبِ مومن ہے۔ چونکہ "عبادات" کا معاملہ زیادہ نازک ہے اس لئے ابتداءً انہیں وحدتِ قانون کے دائرے سے الگ رکھا جائے۔ جب زندگی کے باقی دوائر میں وحدت پیدا ہو جائے گی تو کچھ عرصہ کے بعد ہم نہیں تو ہماری آنے والی نسلیں، اس باب میں بھی وحدتِ عمل کی ضرورت محسوس کر کے، ایک مشترک راستہ اختیار کر لیں گی۔ باقی رہی ہماری سیرت و کردار کی وحدت، سو اس کے لئے حضورؐ کا اسوۂ حسنہ ہر مسلمان کے لئے قندیلِ راہ ہے۔ جو اس شمع نورانی کو اپنا راہ نما تسلیم نہیں کرتا' اسے نہ خدا سے کوئی واسطہ ہو سکتا ہے نہ اس کے رسول سے کوئی تعلق۔ اس کی دنیا بھی خراب ہے اور عاقبت بھی تباہ۔ یہ اسوۂ مقدسہ، قرآن کریم کی دفتین میں محفوظ ہے۔ جو تفاصیل اس کے باہر ہیں' ان کی صحت و سقم کے پرکھنے کا معیار خود قرآن کریم ہے۔ یوں قرآن کریم کی تعلیم اور حضورؐ کی سیرتِ طیبہ مسلمانوں ہی کے لئے نہیں پوری انسانیت کے لئے نجات و سعادت کا واحد، مکمل اور آخری ذریعہ قرار پاتی ہیں۔

اگر باو نرسیدی تمام بولہبی است

کاتب کی ضرورت ہے

دہلوی طرزِ نگارش کے ماہر (عربی اُردو یکساں) کتابی کاتب کی ضرورت ہے۔ ضرورتمند حضرات نمونہ ساتھ لائیں۔ اور اس پتہ پر ملیں۔ ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ - بی - گلبرگ - لاہور

طلوعِ اسلام کا مسلک

۱۔ نبی اکرمؐ کی سیرتِ طیبہ، تمام نوعِ انسان کے لئے قیامت تک، بلندیٔ اخلاق و کردار کا بہترین نمونہ (اسوۂ حسنہ) ہے جس کے اتباع میں شرفِ انسانیت کا راز پنہاں ہے۔

۲۔ احادیث کے مجموعوں میں صحیح حدیثیں بھی ہیں اور وضعی بھی۔ جو روایت، قرآن کریم کے خلاف ہو یا اس سے نبی اکرمؐ کی سیرتِ طیبہ پر کسی قسم کا حرف آتا ہو وہ صحیح نہیں ہو سکتی۔

۳۔ اُمت کے مختلف فرقے، اسلامی ارکان کو جس طرح ادا کرتے چلے آ رہے ہیں، ان میں کسی قسم کے تغیر و تبدل کرنے یا کوئی نیا طریقہ ایجاد کرنے کا کسی کو حق نہیں۔ البتہ اگر کسی وقت خلافت علیٰ منہاجِ نبوت کا دوبارہ قیام ہو جائے اور وہ اُمت میں پھر سے وہی وحدت پیدا کرنے کے لئے، جو ابتدائے اسلام میں تھی، ان کے لئے کوئی ایک طریقہ متعین کر دے تو اس سے اُمت کا موجودہ اختلاف اور انتشار ختم ہو جائے گا۔

۴۔ جو مملکت اس امر کا اقرار و اعلان کرے کہ اس کا تمام کاروبار قرآن کریم کی متعین کردہ حدود کے اندر رہتے ہوئے سرانجام پائے گا اور اس کا فریضہ قوانین خداوندی کا نفاذ ہوگا۔ اور اس مملکت کے چلانے والے، سیرتِ محمدیہ کے قالب میں ڈھلے ہوں، وہ مملکت صحیح اسلامی مملکت کہلائے گی۔ اسی کو خلافت علیٰ منہاجِ نبوت یا اسلامی نظام کہا جاتا ہے۔ اور اس کی سنٹرل اتھارٹی کو "مرکزِ ملت" کی اصطلاح سے پکارا جاتا ہے۔ اس کا طریق شوریٰ ہوگا۔

۵۔ خلافت علیٰ منہاجِ نبوت یا اسلامی مملکت میں، تمام مسلمانوں کے لئے ایک ہی قانونِ شریعت ہوتا ہے۔ مختلف فرقوں کے لئے مختلف قوانین نہیں ہوتے۔ اس میں تمام مسلمان ایک اُمت کے افراد ہوتے ہیں۔ فرقوں میں بٹے ہوئے نہیں ہوتے۔ رسول اللہؐ کے زمانے میں اُمت میں کوئی فرقہ نہیں تھا۔

۶ــــ اس وقت مختلف فرقوں کے اپنے اپنے قوانین شریعت ہیں۔ ان میں سے کوئی فرقہ کسی دوسرے فرقے کے قانون کو، اسلامی قانون تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں۔ اندریں حالات، تمام مسلمانوں کے لئے واحد اور مشترک اسلامی قانون مدوّن کرنے کا طریقہ یہی ہے کہ

(۱) قرآن کریم کو قانون کی غیر متبدل بنیاد قرار دیدیا جائے۔ مختلف فرقوں کا قرآن الگ الگ نہیں۔ قرآن سب کا ایک ہی ہے۔ لیکن فقہ اور روایات ہر ایک کی الگ الگ ہیں۔

(۲) قرآن کریم کو بنیاد قرار دے کر، مختلف فرقوں کی فقہ اور روایات کو سامنے رکھا جائے، اور ان کی روشنی میں ارباب علم و بصیرت کی مشاورت سے ایسا قانون مرتب کیا جائے جو ہمارے زمانے کی ضروریات کو پورا کر سکے۔

اس کے سوا، امت میں وحدت پیدا کرنے اور مسلمانوں کو ایک مرکز پر لانے کی کوئی صورت نہیں۔

۷ــــ طلوع اسلام کا مسلک ہنگامے برپا کرنا نہیں بلکہ، دلائل و شواہد اور علم و بصیرت کی رُو سے قرآن کریم کی تعلیم کو اس طرح پیش کرنا ہے جس سے قلب اور دماغ میں صحیح تبدیلی پیدا ہو جائے، کہ اس قسم کی تبدیلی کے بغیر، سیرت و کردار میں تبدیلی پیدا نہیں ہو سکتی۔

۸ــــ طلوع اسلام کا تعلق نہ کسی سیاسی پارٹی سے ہے نہ مذہبی فرقہ سے۔ نہ عملی سیاست میں حصہ لینا اس کے پروگرام میں ہے۔ پاکستان کا استحکام۔ ملت کی وحدت اور قرآن کریم کی بنیاد پر صحیح اسلامی نظام کا قیام، اس کا نصب العین ہے۔

اسلامی معاشرت

از پرویز

بچوں، عورتوں، کم تعلیم یافتہ لوگوں کے لئے زندگی کے روزمرہ کے معاملات کے متعلق قرآن کریم کے احکام۔ قیمت دو روپے

ملنے کا پتہ:- میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ۔ ۲۷۔ بی شاہ عالم مارکیٹ ــ لاہور

روزہ کے احکام

چونکہ رمضان المبارک کا مہینہ قریب آرہا ہے اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ (معمول کے مطابق[1]) قرآن کی رُو سے روزے کے احکام مختصر الفاظ میں بیان کر دیئے جائیں۔ یہ احکام سورۂ بقر میں آئے ہیں۔ متعلقہ آیات یہ ہیں۔

(۱) يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ۝

(۱) اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! جس طرح تم سے پچھلی قوموں پر روزہ فرض کیا گیا تھا۔ اسی طرح تم پر بھی روزہ فرض کر دیا گیا ہے۔ تاکہ تم قانونِ خداوندی کی نگہداشت کر سکو۔

(۲) أَيَّامًا مَّعْدُودَاتٍ۔

(۲) یہ روزے چند گنے ہوئے دنوں کے ہیں۔

(۳) فَمَن كَانَ مِنكُم مَّرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ۔

(۳) پھر جو کوئی تم میں سے بیمار ہو یا سفر میں ہو تو وہ دوسرے دنوں میں روزے رکھ کر گنتی پوری کر دے

(۴) وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ۔

(۴) اور جو لوگ بدشواری روزہ رکھ سکیں ان کیلئے روزے کے بجائے ایک مسکین کو کھانا کھلا دینا کافی ہے۔

(۵) فَمَن تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهُ وَأَن تَصُومُوا خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ ۝

(۵) اس کے بعد بھی اگر کوئی اپنی خوشی سے زیادہ کرے تو مزید اجر کا موجب ہوگا۔ اگر تم سمجھ بوجھ رکھتے ہو تو تمہارے لئے روزہ رکھنا بہتر ہے۔

---

[1] ان احکام کو ہم اس سے پہلے بھی کئی بار درج کر چکے ہیں لیکن ہم ان کے اعادہ کی ضرورت ہر سال سمجھتے ہیں۔ اس لئے انہیں پھر دہرایا جا رہا ہے

(۶) شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ .....

(۷) فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ وَمَنْ كَانَ مَرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ۔ (۲/۱۸۵-۱۸۴)

(۸) وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ (۲/۱۸۷)

(۹) اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمْ۔ (۲/۱۸۷)

(۶) روزے رمضان کے مہینے کے ہیں جس میں قرآن نازل کیا گیا ہے۔

(۷) لہٰذا تم میں سے جو کوئی اس مہینہ میں اپنے گھر پر موجود ہو تو اسے اس مہینے کے روزے رکھنے چاہئیں۔ البتہ اگر تم میں سے کوئی بیمار ہو یا سفر میں ہو تو وہ دوسرے دنوں میں گنتی پوری کرے

(۸) اور کھاؤ پیو یہاں تک کہ تمہارے لئے صبح کی سفیدی دھاری سیاہ دھاری سے متمیز ہو جائے۔ پھر رات تک روزہ پورا کرو۔

(۹) اور تمہارے لئے روزوں کی راتوں میں اپنی بیویوں سے اختلاط حلال کیا گیا ہے۔

ان آیات سے معلوم ہو گیا کہ

(۱) روزے رمضان کے مہینے کے ہیں (تین دن یا تو دن کے نہیں بلکہ پورے مہینے کے)

(۲) روزے میں اُس وقت سے لے کر جب صبح کی سفیدی نمودار ہو جائے، دن کے ختم ہونے تک، کھانا پینا اور بیوی سے اختلاط منع ہے۔

(۳) روزے اس کے لئے ہیں کہ جو اس مہینے میں اپنے گھر پر موجود ہو اور تندرست ہو۔ مریض تندرست ہونے پر اور مسافر سفر سے واپسی پر دوسرے دنوں میں روزے رکھ کر گنتی پوری کر دے۔

(۴) اب ایک شکل اور باقی رہ جاتی ہے اور وہ یہ کہ ایک شخص (تمام عرفی معنوں میں) نہ تو بیمار ہے اور نہ مسافر ہے لیکن کسی وجہ سے اُسے روزے رکھنے دشوار ہیں۔ مثلاً ایک بوڑھا آدمی اپنے گھر پر موجود ہے۔ اور مریض بھی نہیں لیکن بڑھاپے کی وجہ سے کمزور اتنا ہے کہ بمشکل روزہ رکھ سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ رمضان کے بعد دوسرے دنوں میں رکھ کر گنتی پوری کر دے۔ ایسے لوگوں کا حکم آیت نمبر ۴ میں بیان کر دیا گیا ہے کہ جو لوگ ایسے ہوں کہ بمشکل روزہ رکھ سکتے ہیں انہیں اپنے آپ کو دشواری میں ڈالنے کی ضرورت نہیں وہ روزے کے بجائے ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں۔

غور فرمایئے اوپر کی تینوں شقوں میں ہر قسم کے حالات جمع ہو گئے ہیں اور یہی احکام کی جامعیت کا تقاضا تھا۔

ہم نے وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ کا ترجمہ ـــــ وہ لوگ جو بدشواری روزہ رکھ سکیں ـــــ کیا ہے۔ حالانکہ اس کا عام ترجمہ ـــــ اور جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت رکھتے ہوں ـــــ کیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ترجمہ صحیح نہیں۔ اس لئے

کہ اس ترجمہ کی رو سے مطلب یہ ہوگا کہ جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت رکھتے ہوں ۔ وہ تو ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں اور جن میں روزہ رکھنے کی طاقت ہی نہ ہو وہ روزے رکھا کریں۔ حالانکہ قرآن کا منشا یہ نہیں ہو سکتا۔ بات یہ ہے کہ لفظ "طاقت" کا جو مفہوم ہمارے ہاں اردو میں رائج ہے وہ اس سے مختلف ہے جو عربی زبان میں اس کا مفہوم ہوتا ہے۔ عربی زبان میں اس لفظ کا کیا مفہوم ہوتا ہے اس کے لئے عربی زبان کی لغات دیکھئے۔ محیط المحیط جلد دوم صفحہ ۱۳۰۴ میں ہے۔

طاقت کے معنی کسی چیز پر قدرت رکھنا ہیں لیکن یہ قدرت کی ایسی مقدار کو کہتے ہیں کہ جسے انسان بمشقت کر سکتا ہے۔ دراصل یہ لفظ اس طوق سے ماخوذ ہے جو کسی چیز کو اپنے گھیرے میں لے لیتا ہے۔ لَا تُحَمِّلْنَا مَالَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ کے معنی یہ نہیں کہ جس کی ہمیں قدرت نہ ہو بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ جس کا بجا لانا ہمیں دشوار ہو۔

اسی طرح عربی کی مشہور لغت لسان العرب صفحہ ۱۰۳ جلد ۱۲ میں ہے کہ

طاقت قدرت کی اس مقدار کا نام ہے جو کسی انسان کے لئے بمشقت کرنا ممکن ہو۔

مفتی محمد عبدہ اپنی تفسیر المنار صفحہ ۱۵۵ جلد ۲ میں فرماتے ہیں کہ

اَلطَّاقَةُ دراصل مَكِنَةٌ اور قُدْرَةٌ کے بالکل ادنیٰ درجہ کا نام ہے چنانچہ عرب أَطَاقَ الشَّيْءَ صرف اس وقت کہتے ہیں جب اس کی قدرت نہایت ہی ضعیف ہو یعنی بدشواری اسے برداشت کر سکتا ہو چنانچہ یُطِیْقُوْنَہٗ سے مراد بوڑھے، ضعیف اور اپاہج لوگ ہیں جن کے اعذار کے دور ہو جانے کی کوئی توقع نہیں کی جا سکتی اور وہ لوگ ہیں جو ان ہی کی طرح معذور ہیں یعنی ایسے کام کاج کرنے والے لوگ جن کی معاش خدا نے پُر مشقت کاموں میں رکھ دی ہے ..... اسی بنا پر امام راغب نے لکھا ہے کہ

طاقت قدرت کی اس مقدار کا نام ہے جس کا کرنا انسان کے لئے بمشقت ممکن ہو۔

اسی کی تائید تفسیر کشاف سے بھی ہوتی ہے جس میں لکھا ہے کہ

طَاقَةٌ کے مفہوم میں وہ کام آتے ہیں جنہیں بتکلیف یا بمشقت کیا جا سکے اور وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ سے مراد بوڑھے مرد اور بوڑھی عورتیں ہیں جن کے لئے روزہ نہ رکھ کر فدیہ دینے کا حکم ہے چنانچہ اسی بناء پر یہ آیت ثابت ہے، منسوخ نہیں ہے۔ (تفسیر کشاف صفحہ ۲۵۵ جلد ۱)

تفسیر روح المعانی میں ہے کہ

عربی زبان میں اَلْوُسْعُ کا لفظ اس قدرت کا نام ہے جو سہولت کے ساتھ ہو اور اَلطَّاقَةُ کا لفظ اس قدرت کا نام ہے جو شدت اور مشقت کے ساتھ ہو۔ لہٰذا آیہ زیر نظر کے معنی یہ ہوں گے اور ان لوگوں پر جو شدت اور مشقت کے ساتھ روزہ رکھ سکتے ہیں، ایک مسکین کو کھانا کھلا دینا ہے .... (روح المعانی صفحہ ۵۹ جلد ۲)

تصریحات بالا سے آپ نے دیکھ لیا کہ عربی زبان میں لفظ "طَاقَةٌ" کا مفہوم کیا ہے اور اس بناء پر وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ کا ترجمہ ـــ اور جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت رکھتے ہوں ـــ صحیح نہیں ہو سکتا۔ اس کا صحیح ترجمہ یہ ہے کہ ـــ جو لوگ بدشواری روزہ رکھ سکیں۔

جیسا کہ آپ جانتے ہیں قرآن کا اسلوب یہ ہے کہ وہ ایک اصول بیان کر دیتا ہے اور اسے امت کے اجتماعی نظام پر چھوڑ دیتا ہے کہ وہ اس کی جزئیات خود متعین کرے۔ چنانچہ عَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ میں بھی یہی اسلوب اجتماعی اختیار کیا گیا ہے۔ یہاں ایک اصول بیان کر دیا گیا ہے اور اس کی تفصیلات خود بیان نہیں کیں (کہ وہ لوگ کون ہیں جو بہ مشقت روزہ رکھ سکتے ہیں) اس کی تفاصیل پہلے بھی متعین کی جا چکی ہیں اور ان پر اب بھی غور کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ علامہ قرطبی کی کتاب "جامع احکام القرآن" (صفحہ ۲۲۸ - ۲۶۹ - جلد ۲) میں ہے کہ

> تمام علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ بوڑھے مرد اور بوڑھی عورتیں جو روزہ رکھنے کی طاقت ہی نہیں رکھتے یا شدید مشقت کے ساتھ طاقت رکھتے ہیں، ان کے لئے روزہ نہ رکھنا جائز ہے۔ مگر اس میں اختلاف ہے کہ ایسے لوگوں کے ذمہ کیا ہے۔ چنانچہ امام ربیعؒ اور امام مالکؒ نے کہا ہے کہ ان کے ذمے کچھ بھی نہیں ہے۔ البتہ امام مالکؒ نے کہا کہ اگر یہ لوگ روزانہ ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں تو میرے نزدیک یہ پسندیدہ ہے۔ اور حضرت انسؓ، ابن عباسؓ، قیس ابن السائبؓ اور ابو ہریرہؓ نے فرمایا ہے کہ ان لوگوں کے ذمہ فدیہ ہے۔ امام شافعیؒ اور اصحاب الرائے (حنفیہ) امام احمدؒ اور امام اسحاقؒ کا قول بھی یہی ہے۔ نیز ابن عباسؓ کی روایت یہ ہے کہ انہوں نے اپنی ام ولد سے فرمایا جو حاملہ تھی یا بچہ کو دودھ پلا رہی تھی کہ تو ان لوگوں میں سے ہے جو بہ مشقت روزے رکھ سکتے ہیں۔ لہٰذا تیرے ذمہ فدیہ ہے۔ قضا نہیں ہے۔

مفتی سید محمد عبدہٗ نے اور بھی اضافہ فرمایا ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ

> الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ سے یہاں مراد بوڑھے ضعیف اور وہ بانجھ لوگ ہیں جن کے اعذار کے دور ہو جانے کی امید نہیں ہوتی۔ ایسے ہی وہ لوگ بھی ان کے زمرے میں شمار ہوں گے جو مزدور پیشہ ہوں جن کی معاش خدا نے پُر مشقت کاموں میں رکھ دی ہے۔ مثلاً کانوں سے کوئلہ نکالنے والے اور وہ مجرم جن سے قید خانوں میں مشقت کے کام لئے جاتے ہیں اور جن پر روزہ رکھنا گراں ہو ۔۔۔ تیسری قسم کے وہ لوگ ہیں جن پر کسی ایسی وجہ سے جن کے دور ہو جانے کی کوئی امید نہ ہو، روزہ رکھنا گراں گزرتا ہو جیسے بڑھاپا۔ اور پیدائشی کمزوری۔ اور ہمیشہ محنت کے کاموں میں مشغولیت۔ اور پرانی بیماری جس کے اچھا ہونے کی امید نہ ہو۔ ایسے ہی وہ شخص جن کی مشقت کا سبب ہوتا رہتا ہے جیسے حاملہ عورت اور دودھ پلانے والی عورت"

ان سب لوگوں کے لئے جائز ہے کہ وہ روزہ کے بجائے ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں۔ اتنا کھانا جو ایک اوسط درجے کی خوراک کے آدمی کا پیٹ بھر سکے۔ (تفسیر المنار صفحہ ۱۵۵-۱۵۷ جلد ۲)

ان تفاصیل سے حسب ذیل فہرست مرتب ہو جاتی ہے۔

۱۔ بوڑھا مرد اور بوڑھی عورت۔

۲۔ حاملہ عورتیں۔

۳۔ دودھ پلانے والی عورتیں۔

۴۔ اپاہج اور معذور لوگ۔

۵۔ پرانی بیماریوں والے جن کے اچھا ہونے کی امید نہ ہے اور وہ ان کی وجہ سے روزہ بمشقت رکھ سکیں۔

۶۔ ایسے کمزور لوگ جو خلقی اور پیدائشی طور پر (constitutionally) کمزور پیدا ہوئے ہوں۔

۷۔ وہ مزدور پیشہ لوگ جن کی معاش ہمیشہ پُرمشقت کاموں میں ہوتی ہے۔ مثلاً کانوں میں کام کرنے والے اور کارخانوں میں کام کرنے والے یا رکشہ چلانے والے۔

۸۔ وہ مجرم جن سے جیل میں مشقت کے کام لئے جاتے ہوں۔

یہ فہرست جامع اور مانع نہیں۔ بحالات موجودہ، اپنے اپنے حالات کے مطابق اس میں اضافہ ہو سکتا ہے۔ اصول یہی ہے کہ جو شخص بمشقت روزہ رکھ سکے وہ روزہ نہ رکھے۔

یہ ہیں روزوں کے متعلق مختصر الفاظ میں قرآن کے احکام۔ ان آیات کو آپ خود بھی قرآن کریم میں دیکھ لیں۔ (یعنی سورۂ بقرہ۔ آیات ۱۸۳ تا ۱۸۸)

مفت

دوا برائے دمہ و درد گردہ و پتھری

ملنے کا پتہ:۔ حاجی محمد دین۔ شیخ آئس فیکٹری متصل گنیش کھوپڑا ملز۔ لارنس روڈ۔ کراچی

اپنے پتہ کا لفافہ بھیج کر دوا مفت منگالیں

باب المراسلات

حج کی اہمیت

سوال :- آپ کے متعلق مشہور کیا جاتا ہے کہ آپ حج کی اہمیت کے بھی قائل نہیں۔ براہ کرم اس ضمن میں اپنی پوزیشن واضح کر دیجئے۔

جواب :- میرے متعلق کیا کیا مشہور نہیں کیا جاتا۔ اور میں کس کس باب میں اپنی پوزیشن واضح کروں؟ مشہور کرنیوالوں کے پاس پراپیگنڈا کی وسیع مشینری ہے جس کی مدد سے وہ جو جی میں آئے اسے پھیلا سکتے ہیں۔ کسی کے خلاف افترا پردازی اور کذب بیانی سے انسان کو صرف ایک چیز روک سکتی ہے اور وہ یہ کہ کہنے والے کو اس کا احساس ہو کہ جو کچھ وہ کہتا ہے اس کے متعلق اس سے خدا کے ہاں بازپرس ہوگی۔ اگر اس خیال کو دل سے نکال دیا جائے تو پھر اسے کوئی چیز تہمت تراشیوں اور کذب بافیوں سے باز نہیں رکھ سکتی۔

حج کے متعلق میری متعدد شائع شدہ تحریریں موجود ہیں جن سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ میرے نزدیک اس عظیم اجتماع کی اہمیت کس قدر ہے۔ میں صلوٰۃ کے مقامی اجتماعات اور حج کے عالمگیر اجتماع کو، اسلامی نظام زندگی کی بنیاد قرار دیتا ہوں۔ اور اسی لئے اس پر زور دیتا ہوں کہ ان اجتماعات کو رسمی طور پر منعقد نہ کیا جائے بلکہ اس مقصد کو پیش نظر رکھا جائے جس کے لئے یہ اجتماعات مقرر کئے گئے ہیں۔ مثلاً میری ایک ریڈیائی تقریر (مطبوعہ فردوس گم گشتہ) کے اخیر میں آپ یہ لکھا ہوا پائیں گے۔

جمعیتِ آدم

حج سے مقصود اسی "جمعیتِ آدم" کی تشکیل تھا۔ اس حج پر نگاہ رکھئے اور پھر اس حج پر جو آج چند رسوم کا بے جان اور بے مقصد مجموعہ بن کر

رہ گیا ہے۔ لیکن اس آئینِ کہن میں آج بھی وہی روح پیدا کی جا سکتی ہے جو انسانیت کے شرف کی کفیل ہے۔ آج عالمِ اسلامی چاروں طرف سے مصائب و نوازل سے گھرا ہوا ہے۔ غیر خدائی قوتیں ان کے خلاف متحدہ محاذ قائم کئے ہوئے ہیں کہ دنیا کے نقشے پر کہیں ان کا نشان نہ رہنے پائے۔ مسلم اقوام کے نمایندے مختلف مقامات پر کانفرنسیں مقرر کر رہے ہیں کہ باہمی اتحاد سے ان مخالف قوتوں کا مقابلہ کیا جائے۔ تمام اسلامی ممالک میں اخوت اور روابط کی تحریکیں چلائی جا رہی ہیں۔ باہمی میل ملاپ کے سلیقے ڈھونڈے جاتے ہیں یہ سب کچھ ہو رہا ہے لیکن کسی کی نگاہ اس طریقِ ربط و اخوت کی طرف نہیں اٹھتی جسے ہمارے خدا نے ہمارے لئے متعین کیا تھا۔ جس سے ہمارے دلوں میں ائتلاف اور نگاہوں میں یکرنگی پیدا ہو جاتی تھی ہم اسے بے کیف رسم بنائے ہوئے ہیں اور اس میں روح پھونکنے کی کوئی تجویز نہیں سوچتے۔

حقیقت یہ ہے کہ جب تک ہم دیگر اقوامِ عالم کی تقلید میں کانفرنسیں طلب کرتے رہیں گے ہماری کامیابیاں انہی کے پیمانوں سے ماپی جائیں گی لیکن جس وقت ہم نے اپنے اللہ سے بھلایا ہوا عہد استوار کر لیا اور پھر اسی مرکز کو زندہ کر دیا جس کی ۔۔۔۔ زندگی سے تمام نوعِ انسانی کی زندگی وابستہ ہے۔ اقوامِ عالم کی امامت ہمارے حصہ میں آجائے گی۔ ہماری زندگی کے چشمے کی سوتیں عرفات کے منبر سے پھوٹیں گی اور اسی سے ہماری کشتِ حیات سرسبز و شاداب ہوگی۔ آج مسلمانانِ عالم کو حج کا فریضہ پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ اس سے مقصود یہ ہے کہ

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے
نیل کے ساحل سے لے کر تابخاکِ کاشغر

میں قوم کے نوجوانوں کو اس کی تلقین اور تاکید کرتا رہتا ہوں کہ اگرچہ ان اجتماعات میں اس وقت ان کی حقیقی روح نہیں رہی لیکن اس کے باوجود ان کا قائم رکھنا نہایت ضروری ہے اس لئے کہ

اگر کبھی ہماری قسمت نے پلٹا کھایا اور ہم میں اس انقلاب کا احساس پیدا ہوا جو قرآن پیدا کرنا چاہتا ہے، تو انہی بے جان پیکروں میں پھر سے روح آجائے گی اور یہ مناسک و شعائر جس نظام کی یادگار ہیں، اس کے از سرِ نو قیام میں آسانی پیدا ہو جائے گی۔

(سلیم کے نام خطوط، حصہ اول۔ صفحہ ۲۶)

پچھلے سال میں نے ہفتہ وار درسِ قرآن میں جب حج سے متعلق آیات سامنے آئی تھیں تو میں نے اس کی اہمیت کو کس

انداز میں واضح کیا گیا تھا، اس کا اندازہ وہ احباب کر سکتے ہیں جو ان درسوں میں شریک تھے۔ یا جنھوں نے انھیں بعد میں ٹیپ ریکارڈ سے سنا ہوگا۔

باقی رہا میرا یہ کہنا کہ ان اجتماعات کو محض رسم نہیں بنا لینا چاہیئے، تو ایسا کہنے میں، میں منفرد نہیں۔ اس "جرم" میں میرے ساتھ اور بھی شریک ہیں۔ مثلاً محترم سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی اس ضمن میں لکھتے ہیں۔

افسوس ہے کہ دین کا یہ تصور رفتہ رفتہ مسلمانوں کے ذہن سے محو ہوتا جا رہا ہے اور دین و دنیا کی علیحدگی کا وہی جاہلی تصور اس کی جگہ لے رہا ہے جس کو اسلام نے مٹا دیا تھا۔ یہ اسی غلط تصور کا نتیجہ ہے کہ عبادات اور معاملات کا باہمی تعلق منقطع ہو گیا۔ عملی زندگی سے نمازوں کا ربط ٹوٹ گیا۔ معاشیات پر زکوٰۃ کی فرماں روائی باقی نہ رہی۔ سال کے گیارہ مہینے رمضان کی حکومت سے آزاد ہو گئے بلکہ رمضان غریب خود بھی اپنے حدود میں صرف حلق کا دربان بنا کر رکھ دیا گیا۔ حج کی حیثیت ہندوؤں کی یاترا اور عیسائیوں کی (PILGRIMAGE) سے زیادہ نہ رہی اور یہ غلط فہمی عام طور پر لوگوں میں پھیل گئی کہ نماز اور فحشا و منکر۔ روزے اور فسق و فجور، زکوٰۃ اور حرام خوری۔ حج اور ہتکِ حرمات ساتھ ساتھ چل سکتے ہیں۔ (تفہیمات حصہ دوم۔ صـ۱۸۳)

وہ دوسری جگہ لکھتے ہیں۔

اس بے روح مذہبیت کا پہلا بنیادی نقص یہ ہے کہ اس میں اسلام کے عقائد اور عبادات کا کوئی ربط اجتماعی نظام اور کاروبارِ حیات دنیا سے نہیں رہا ہے۔ اسلام کے عقائد محض ایک دھرم (RELIGION) کے مزعومات (DOGMAS) بنا کر رکھ دیئے گئے ہیں۔ حالانکہ وہ ایک مکمل فلسفۂ اجتماع اور نظام تمدن کی منطقی بنیاد ہیں۔ اور اسی طرح اس کی عبادات محض پوجا اور پتیا بنا کر رکھ دی گئی ہیں حالانکہ وہ ان ذہنی اور اخلاقی بنیادوں کو مضبوط و مستحکم کرنے کے وسائل ہیں جن پر اسلام نے اپنا نظامِ اجتماعی تعمیر کیا ہے۔ اس عمل تحریف کا نتیجہ یہ ہے کہ لوگوں کی سمجھ میں کسی طرح یہ بات نہیں آتی کہ آخر ایک سیاسی، معاشی اور تمدنی لائحہ عمل کو چلانے کے لئے ان عقائد اور عبادات کی ضرورت ہی کیا ہے۔

(سیاسی کشمکش حصہ سوم۔ بحوالہ ترجمان القرآن۔ صـ۳۶)

امید ہے ان تصریحات سے میری پوزیشن بھی واضح ہو گئی ہوگی اور میرے خلاف پراپیگنڈا کرنے والوں کی ذہنیت بھی۔ والسلام۔ "پرویز"

سلیم کے نام

سلیم میاں! ایک عرصہ کے بعد تمہارا خط ملا۔ جو کچھ تم نے پوچھا ہے اس سلسلہ میں تمہیں یاد ہوگا کہ میں نے ایک دفعہ ایک مغربی مفکر کا قول لکھا تھا جس نے کہا ہے کہ اگر تم مجھے یہ بتا دو کہ فلاں قوم نے اپنے لئے کس قسم کا معبود تجویز کر رکھا ہے تو میں تمہیں اس قوم کی تہذیب، تمدن، معاشرت، وغیرہ کے متعلق سب کچھ بتا دوں گا۔ سطحی نگاہوں کو تو یہ نظر نہیں آتا کہ خدا کے تصور سے قوم کی تہذیب و تمدن کا کیا تعلق ہو سکتا ہے لیکن ذرا گہرائی میں اتر کر دیکھئے تو یہ حقیقت بے نقاب ہو کر سامنے آجاتی ہے کہ جس قسم کا خدا کا تصور ہو اسی قسم کی وہ قوم ہوتی ہے۔ فرد ہو یا قوم، وہ اپنے آپ کو، شعوری یا غیر شعوری طور پر اپنے معبود کے قالب میں ڈھال لیتی ہے۔ اگر وہ معبود اس قوم کے اپنے ذہن کا تراشیدہ ہے، تو ظاہر ہے کہ جس قسم کا اس قوم کا ذہن ہوگا، اسی قسم کا وہ معبود ہوگا۔ اور اگر وہ معبود اس قوم کے اپنے ذہن کا تراشیدہ تو نہیں، لیکن اس نے اُسے معبود تسلیم کر لیا ہے۔ تو بھی اس کا اثر واضح ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ انسان اسی تصور کو بطیب خاطر قبول کرتا ہے جو اس کے خیالات اور نظریات سے ہم آہنگ ہو۔ یا وہ اس نصب العین پر پورا اترتا ہو جسے اس نے معبودِ حیات اپنے سامنے رکھا ہو۔ تم کسی زاویۂ نگاہ سے بھی دیکھو، یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ شعوری یا غیر شعوری طور پر خدا کے تصور کا اثر فرد اور اس سے آگے بڑھ کر قوم کی ساری زندگی پر پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن، ایمان باللہ پر اس قدر زور دیتا ہے۔ اسلام نے قرنِ اول میں جو ایک فعال العقول امت پیدا کر دی تھی، تو اس کی وجہ یہی تھی کہ اس قوم نے اپنے سامنے خدا کا وہ تصور رکھا تھا جسے قرآن کریم نے ایسے بلند، پاکیزہ اور منزہ انداز میں تشریح و بسط سے پیش کیا ہے۔ اور آج جو اس قوم کی حالت اس قدر عبرت ناک ہو چکی ہے، تو اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ اس نے قرآن کے پیش کردہ خدا کے تصور کے بجائے، غیر قرآنی خدا کا تصور اپنے سامنے رکھ چھوڑا ہے مثلاً دو چار باتوں پر غور کرو۔

(۱) پچھلے مہینہ کی بات ہے، ایک صاحب ایک مجلس میں باتیں کر رہے تھے۔ ابھی تین چار سال کا عرصہ ہوا، وہ غالباً اوورسیر تھے۔ اور اب انجینئر کے عہدہ پر سرفراز تھے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ صاحب میں تو ہر صبح اٹھ کر خدا کے حضور ہزار ہزار سجدہ کرتا ہوں کہ اس نے میرے جیسے انسان کو اس مقام پر پہنچا دیا جس کا میں ہرگز اہل نہیں تھا۔ بڑے بڑے ڈگریوں والے، ولایت اور امریکہ کے پاس شدہ انجینئر دھکے کھاتے پھر رہے ہیں۔ کوئی پوچھتا تک نہیں لیکن اس نے مجھ ایسے نااہل پر ایسا کرم کیا ہے۔ یا اللہ تیرا شکریہ کس زبان سے ادا کیا جائے!

وہ یہ کچھ فرما رہے تھے، اور اہلِ محفل سر ہلا رہے تھے۔ تم نے غور کیا سلیم! کہ اس سے کس قسم کے خدا کا تصور سامنے آتا ہے؟ اس قسم کے خدا کا تصور جس کے ہاں ہوتا یہ ہے کہ

(۱) نااہل اور نالائق اونچے اونچے مقامات پر پہنچا دیئے جاتے ہیں اور بڑے بڑے قابل دھکے کھاتے پھرتے ہیں۔ انہیں کوئی پوچھتا تک نہیں۔ یعنی

(۲) اس خدا کے ہاں انتخاب، قابلیت (MERITS) کی بنا پر نہیں ہوتا۔ بلکہ (CONSIDERATIONS) کے مطابق ہوتا ہے۔

اس تصور کا نتیجہ ہے کہ ہمارے معاشرہ کا عام چلن ہی یہ ہو چکا ہے۔ یعنی یہاں معیارِ انتخاب "قابلیت یا موزونیت" نہیں کچھ اور ہے ـــــ اور ہر شخص "قابل یا موزوں بننے کے بجائے اس "کچھ اور" کی تلاش میں رہتا ہے۔ اب ہمارا "ایمان" ہی یہ ہو چکا ہے کہ انسان کو کوئی چیز قابلیت یا موزونیت کی بنا پر نہیں ملتی کسی اور بنا پر ملتی ہے۔ جو شخص محض قابلیت کی بنا پر کسی مقام کے حصول کی کوشش کرتا ہے، اسے ہر شخص بیوقوف قرار دیتا ہے اور دوسرے راستوں کا پتہ نشان بتاتا ہے۔ آخر امر ہوتا بھی یہی ہے کہ اگر وہ اُن راستوں کو اختیار نہیں کرتا تو اُسے ناکامی ہوتی ہے۔ اس کے بعد محض قابلیت کی بنا پر کچھ حاصل کر لینے کا خیال اُس کے دل سے بھی نکل جاتا ہے۔ پھر یہ بھی وہی کچھ کرنے لگ جاتا ہے جو دوسرے لوگ کرتے تھے اور جب اس طرح ایسے مقام کو حاصل کر لیتا ہے جس کے لئے اسے خود اعتراف ہے کہ وہ اس کے قابل نہیں تھا، تو اسے "خدا کا کرم" قرار دے کر اس کھٹک کو بھی دل سے نکال ڈالتا ہے جو اس سے پہلے ایسے وقت میں اس کے دل میں پیدا ہو سکتی تھی۔

غور کرو سلیم! ان انجینئر صاحب کا (فخریہ) یہ کہنا کہ میں اس اسامی پر تعینات ہو گیا ہوں جس کا میں اہل نہیں، لیکن اس کے باوجود میں اسے چھوڑنے کے لئے تیار نہیں، کتنی بڑی بددیانتی ہے۔ اگر اس میں دیانت کا ذرا سا بھی شائبہ ہوتا تو وہ اس اسامی کو قبول ہی نہ کرتا۔ لیکن وہ اسے کیوں نہ قبول کرتا جب اس کا "ایمان" یہ ہے کہ یہ اس کے "خدا کا کرم" ہے اور خدا کے کرم اور بخشش کو قبول نہ کرنا، انتہائی ناسپاس گذاری ہے۔ اگر خدا کے اس تصور کے بجائے، ہمارے سامنے اس کا وہ تصور ہوتا ہے جسے قرآن پیش کرتا ہے تو ہم اس قسم کی غلط بخشیوں کو کبھی خدا کی طرف منسوب نہ کرتے۔ اگر کہیں ایسا ہوتا تو ہم

فوراً کہدیتے کہ یہ غلط ہو رہا ہے۔ اس تعلیم کے خلاف ہو رہا ہے جو خدا کی طرف سے عطا ہوئی تھی۔ یہ اس باطل معاشرہ کے فیصلے ہیں جو قوانینِ خداوندی کے خلاف چل رہا ہے۔ اس کا نتیجہ تباہی اور بربادی کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔ ہمیں اس روش سے رکنا چاہیئے۔ اگر کسی کو قابلیت، اہلیت اور موزونیت کے خلاف کچھ مل گیا ہے تو وہ دینے والے اور لینے والے دونوں کی بددیانتی کا ثبوت ہے۔ اگر یہ دونوں خدا کی متعین کردہ روش کے مطابق چلتے تو ایسا کبھی نہ ہوتا۔ خدا کے ہاں معیار استحقاق اور اہلیت ہے۔ یہی معیار ان لوگوں کے ہاں ہونا چاہیئے جو اُس خدا پر ایمان رکھتے ہیں۔

تم نے دیکھا سلیم! کہ خدا کے تصور کے بدل جانے سے معاشرہ کی حالت اور افراد کی ذہنیت میں کس قسم کی تبدیلی آجاتی ہے۔ ہم اپنے (عمل میں نہیں، بلکہ دعووں میں) بڑے فخر سے کہتے ہیں کہ ہمارے قرنِ اول میں معیارِ انتخاب، اہلیت اور استحقاق تھا۔ (اور یہ بات ہے بھی ایسی جس پر وہ قرن بجا طور پر فخر کر سکتا ہے) لیکن کبھی نہیں سوچتے کہ اس کی وجہ کیا تھی؟ اس کی وجہ یہ تھی کہ اُن کے سامنے خدا کا یہ تصور تھا جسے قرآن کریم نے پیش کیا تھا اور جس کی رو سے خدا کے ہاں معیارِ انتخاب، اہلیت اور استحقاق ہے۔ ہم نے اس تصور کی جگہ خدا کا ایسا تصور قائم کر لیا جو ہماری خواہشات اور مفادات کے چوکھٹے میں فٹ بیٹھے۔ اس کے بعد ہماری ہر بددیانتی "خدا کا کرم" قرار پائی، اور یوں، ہر گناہ، ثواب بن گیا۔ اب نہ اُس نااہل انجینئر کو اس بات کے اعتراف اور اظہار پر کچھ شرم محسوس ہوئی۔ نہ سننے والوں کا خیال معاشرہ کی بدعنوانیوں کی طرف گیا۔

(۲) یا مثلاً عدالت میں مقدمہ پیش ہے اور رشید صاحب دوڑے دوڑے "حضرت صاحب" کے ہاں پہنچتے ہیں کہ حضور! خدا سے دعا کیجئے کہ مجھے مقدمہ میں کامیابی ہو جائے۔ (ان "حضرت صاحب" میں زندہ اور مردہ دونوں قسم کے بزرگ شامل ہوتے ہیں) اسی پر اکتفا نہیں کیا جاتا بلکہ منتیں بھی مانی جاتی ہیں کہ مقدمہ میرے حق میں ہو گیا تو اتنی دیگیں پکوا کر نیاز بانٹوں گا۔ اتنے روپے خیرات کروں گا۔ مسجد میں سنگِ مرمر کا فرش لگوا دوں گا۔ یہ سب باتیں بظاہر معصوم سی نظر آتی ہیں لیکن تمہیں معلوم ہے کہ خود خدا کے متعلق یہ تصور، افراد اور اقوام کی ذہنیت پر کیا اثر کرتا ہے؟ اس کا مطلب صاف ہے کہ آپ خدا کے متعلق یہ تصور رکھتے ہیں کہ اُس سے کام کرانے کا طریقہ یہ ہے کہ اُس کے کسی مقرب بندے سے اُسے کہلوا دیا جائے۔ یا اس کی نذر نیاز مانی جائے، یعنی کچھ دیا جائے۔ اس تصور کا اثر یہ ہے کہ کسی افسر، حاکم سے آپ کا کوئی کام پڑے، آپ سب سے پہلے یہ سوچتے ہیں کہ اس کا جاننے، ماننے والا کون ہے جس سے اُسے کہلوایا جائے۔ یا کچھ دے دلا کر کام کرایا جائے۔ یہ تصور اب اس قدر عام ہو چکا ہے کہ اسے قطعاً معیوب نہیں سمجھا جاتا۔ ہر شخص کھلے بندوں اس کا ذکر کرتا ہے، اور دوسروں کو ایسا کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ بات بالکل واضح ہے۔ جب "اللہ میاں" "حضرت صاحب" کی بات مان کر مقدمہ کا فیصلہ اس کے حق میں کر دیتے ہیں جس کی سفارش "حضرت صاحب" نے کی تھی ــــ اور ایسا کرنے میں نہ حضرت صاحب کو کوئی جھجک محسوس ہوتی ہے، اور نہ اللہ میاں کو، ان کا اس طرح کہنا مانا ہوتا ہے تو حاکم تک

سفارش پہنچانے، اور حاکم کے لئے اس سفارش کو مان لینے میں کیا قباحت ہو سکتی ہے؟ اس طرح اگر نذر نیاز دے کر کام کرانے میں کوئی بات قابل اعتراض نہیں، تو حکام یا عمال کو کچھ دے دلا کر کام نکلوا لینا کس طرح قابل اعتراض ہو سکتا ہے؟

یہ ہے سلیم! خدا کے متعلق ہمارے ذہن کا پیدا کردہ تصور۔ اس کے برعکس، قرآن کا دیا ہوا تصور باری تعالیٰ یہ ہے کہ اس کے ہاں نہ کسی کی سفارش چل سکتی ہے۔ نہ کچھ دے دلا کر کام نکلوایا جا سکتا ہے۔ جو کچھ کسی نے کیا ہو، ٹھیک ٹھیک اس کے مطابق فیصلہ ہو جاتا ہے۔ اس میں نہ کسی کی رعایت ہوتی ہے، نہ کسی کی برخلافی۔ ہر معاملہ کا فیصلہ قانون مکافات کے مطابق ہوتا ہے۔ یہ تھا خدا کا وہ تصور جسے سامنے رکھنے کا نتیجہ یہ تھا کہ ہمارے قرن اول کے معاشرہ کی بنیادیں عدل پر استوار تھیں۔ اس میں نہ کسی کو کسی کے پاس سفارش لے جانے کی ضرورت ہوتی تھی نہ کچھ دے دلوا کر کام نکلوانے کی حاجت۔ ضرورت تو ایک طرف کسی کے ذہن میں بھی یہ بات نہیں آ سکتی تھی کہ مجھے ایسا کرنا چاہیئے۔ ہر ایک کو اس کا یقین تھا کہ اس کے معاملہ کا فیصلہ عدل کی رو سے ہوگا —— اور ہوتا بھی ایسا ہی تھا۔ اس لئے کہ جس قسم کا خدا کا تصور، اسی قسم کا معاشرہ۔

(۲) یا مثلاً یہ کہ رزق کا معاملہ خدا نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے۔ وہ جسے چاہے امیر بنا دے۔ جسے چاہے فقیر کر دے۔ اس میں کسی کی کاری گری کو کوئی دخل نہیں۔ بڑے بڑے عقلمند بھوکے مرتے دکھائی دیتے ہیں۔ اور موٹا ملنگ قسم کے لوگ لاکھوں میں کھیلتے ہیں۔ سچ ہے۔

بنا داں آں چناں روزی رساند

کہ دانا اندراں حیراں بماند

وہ جب دینے پر آتا ہے تو چھپر پھاڑ کر دیتا ہے۔ جب اس کا فضل ہوتا ہے تو رزق ایسے ایسے راستوں سے آنا شروع ہو جاتا ہے جو کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتے۔

خدا اگر بہ حکمت بہ بندد درے

کشاید ز فضل و کرم دیگرے

نتیجہ اس تصور کا یہ کہ لوگ، ہر جائز نہ جائز طریقے سے دولت اکٹھی کرتے ہیں۔ چار دن میں جائیدادیں کھڑی ہو جاتی ہیں۔ ٹھاٹھ کی زندگی بسر ہونے لگتی ہے۔ چاروں طرف سے ہن برستا ہے۔ جب کوئی پوچھے کہ یہ کچھ کہاں سے آ گیا، تو نہایت اطمینان سے کہہ دیتے ہیں کہ ھٰذا من فضل ربی۔ میاں! یہ سب کچھ اسی دیالو کی دین ہے، ورنہ میں کس قابل تھا۔ یہ سب اس کا فضل ہے۔ انسان جو جی میں آئے کرے، اس کے فضل کے بغیر کچھ نہیں ہوتا۔ اور جب وہ فضل کرنے پر آتا ہے تو انسان کی خود اپنی سمجھ میں بھی نہیں آتا کہ یہ کیسے ہو گیا۔ وہ مالک بڑا بے نیاز ہے۔ اس کے دینے کے راہ نیارے

ہیں ـــــ یہ کہکر کہنے والا بھی مطمئن ہو جاتا ہے، اور سننے والا بھی۔ اگر وہ ذرا غیر مطمئن سا نظر آئے تو فوراً کہدیا جاتا ہے کہ میاں! تمہارا خدا پر ایمان نہیں رہا۔ تمہارے خیالات دہریوں کے سے ہوتے جا رہے ہیں!

یہ ہے خدا کے متعلق ہمارے ذہن کا تراشیدہ تصور جس کی رو سے، وہ جسے چاہے، بلا قاعدہ اور قانون، اور بلا محنت و مشقت "چھپر پھاڑ کر" دولت دیتا ہے۔ اس کے برعکس قرآن کا عطا کردہ تصور ہے جس کی رُو سے خدا ہر شخص کو اس کی محنت کے مطابق دیتا ہے۔ اس میں نہ کمی کرتا ہے۔ نہ بلا محنت کسی کو کچھ دیتا ہے۔ اب تم دیکھو کہ جو معاشرہ خدا کے اس تصور کے مطابق تشکل ہوگا اس میں رزق کی تقسیم کا معیار کیا ہوگا اور وہ معاشرہ کس قدر حقوقِ انسانیت کا محافظ ہوگا۔ اس میں نہ کسی کو بلا محنت کچھ مل سکے گا نہ کوئی کسی کی محنت کے ماحصل کو غصب کر سکے گا۔ اس میں یہ ہوگا ہی نہیں کہ

دانہ ایں می کارد آں حاصل بُرد

رزق ہی کے بارے میں خدا کے غیر قانونی تصور کا ایک گوشہ وہ ہے جس میں کہا جاتا ہے کہ میاں! جو اس پر بھروسہ کرتا ہے اُسے سب کچھ ملتا ہے۔

خدا خود میر سامان است ارباب توکل را

وہ جب پتھر میں کیڑے تک کو بھی دیتا ہے تو کیا انسان اُس کیڑے جیسا بھی نہیں؟ فرق یہ ہے کہ کیڑا اس پر بھروسہ کرتا ہے اور انسان توکل چھوڑ دیتا ہے۔ یہ امر آزمائش میں جلدی گھبرا جاتا ہے۔ ورنہ یہ بھی اگر اس پر پورا پورا بھروسہ رکھے تو پھر دیکھے کہ اسے کس طرح آسمانوں سے رزق ملتا ہے۔

نتیجہ اس تصور کا یہ کہ معاشرہ میں مستقلاً ایک جماعت ایسی موجود رہتی ہے جو دوسروں کی کمائی پر زندگی بسر کرتی ہے، ایسے لوگوں کی کئی قسمیں ہیں۔ گداگر اور بھک منگے تو یوں ہی بدنام ہیں ـــــ تم اپنے معاشرہ پر نظر ڈالو تو تمہیں یہاں سے وہاں تک، قطار در قطار ایسے لوگ نظر آئیں گے جو خود کچھ نہیں کرتے اور بڑے ٹھاٹھ کی زندگی بسر کرتے ہیں ـــــ کوئی کسی لباس میں کوئی کسی میں۔ جب ان سے کہو تو وہ بڑی بے باکی سے جواب دیتے ہیں کہ ہم کسی کے ہاں مانگنے تھوڑا جاتے ہیں؟ مولا دیتا ہے اور ہم کھاتے ہیں۔ حالانکہ جس رزق کے متعلق یہ کہتے ہیں کہ "مولا دیتا ہے" اس کے متعلق ذرا تحقیق کر کے دیکھو تو وہ کسی نہ کسی کی محنت کی کمائی ہوگی جو ان تک پہنچی ہے۔ خدا کسی کو براہ راست کچھ نہیں دیتا۔ انسان یا خود کمائی کرتا ہے یا کسی کی کمائی میں حصہ دار بنتا ہے۔ توکل کا مسئلہ کسی نہ کسی کی محنت کی کمائی کھاتا ہے۔ اور یہ کہہ کر خود فریب کھاتا یا دوسروں کو فریب دیتا ہے کہ اُسے یہ کچھ خدا کی طرف سے ملتا ہے۔

ایک معاشرہ خدا کے متعلق اس غلط تصور پر قائم ہوتا ہے۔ اور ایک معاشرہ وہ ہے جس میں فرد کا سب، (محنت کرنے والے) کو خدا کا دوست قرار دیا جاتا ہے (الکاسب حبیب اللہ) یعنی جو محنت نہیں کرتا ہے خدا دوست ہی نہیں رکھتا۔ سوچو مسلم! کہ اُس معاشرہ میں انسانوں کی کیفیت کیا ہوگی؟

(۴) یا مثلاً یہ تصور کہ خدا جسے چاہتا ہے عذاب دیتا ہے۔ جسے چاہتا ہے بخش دیتا ہے۔ وہ مالک الملک بے پرواہ ہے۔ یعنی اس کے ہاں نہ کوئی قاعدہ ہے نہ قانون۔ نہ اصول ہے نہ ضابطہ۔ وہ راضی ہو گیا تو ہمارے سب جرم معاف ہو گئے۔ وہ ناراض ہو گیا تو ہمارے سب عمل اکارت ہو گئے۔ ہماری زندگی کا مقصد یہ ہے کہ کسی نہ کسی طرح اس کی خوشنودی حاصل کریں۔

غور کرو کہ بسلیم! آسمان پر خدا کے متعلق اس قسم کے تصور کا عملی نتیجہ اس کے سوا کیا ہے کہ زمین پر ہمارے حکمران ایسے ہوں جو نہ کسی قاعدہ اور قانون کے پابند ہوں، نہ کسی اصول اور ضابطہ کے تابع۔ (اس لئے کہ السلطان ظل اللہ علی الارض۔ بادشاہ زمین پر خدا کا سایہ ہوتا ہے) وہ آمر مطلق ہوں جن کا ہر حکم قانون بن جائے۔ اگر وہ خوش ہو گئے تو انعام واکرام کی بارش ہونے لگی۔ وہ ناراض ہو گئے تو گاؤں کا گاؤں تباہ کر دیا۔ رعایا کا مقصدِ زندگی یہ ہے کہ کسی طرح بادشاہ (یا حاکم) کی خوشنودی مزاج حاصل کرے۔ یہ وہ تصور ہے جو ملوکیت پر صحیح فٹ بیٹھتا ہے۔ اور ایسا معاشرہ قائم کرتا ہے جس میں لاقانونیت کا دور دورہ ہو، اور "حکم حاکم مرگِ مفاجات" جس کا عام انداز ہو۔ یہی وہ انداز معاشرہ ہے جو ہماری تاریخ میں صدیوں سے چلا آرہا ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ہمارے ہاں حکمران طبقہ آمر مطلق رہا ہے، اور رعایا خوشامدی اور تملق پیشہ۔

اس کے برعکس خدا کا وہ تصور ہے جسے قرآن کریم نے پیش کیا۔ اس تصور کی رُو سے خدا نے اپنے لامحدود اقتدار اور بے انتہا اختیار کے باوجود، نظم ونسق عالم کے لئے قوانین وضوابط متعین کر رکھے ہیں، جن میں وہ کبھی تبدیلی نہیں کرتا۔ کائنات کی ہر شے انہی قوانین کے مطابق سرگرم عمل ہے۔ اسی طرح اس نے انسانی دنیا کے لئے قوانین متعین کر دیئے ہیں جو انسان کو بذریعہ وحی دیئے گئے ہیں۔ ان قوانین کے نتائج متعین ہیں۔ جو انسان ان کے مطابق زندگی بسر کرتا ہے۔ ان کے خوشگوار نتائج سے متمتع ہو جاتا ہے۔ جو ان کی خلاف ورزی کرتا ہے، اس کا نتیجہ تباہی اور بربادی ہوتا ہے۔ یہ خوشگوار نتائج اور تباہ کن عواقب۔ اس دنیا میں بھی سامنے آتے ہیں اور مرنے کے بعد کی زندگی میں بھی نمودار ہوں گے۔ جزا اور سزا، جنت اور جہنم، انسانی اعمال ہی کے فطری نتائج کا نام ہے۔ ان قوانین خداوندی کے نتائج کو اٹل سمجھنے کا نام ایمان اور ان کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دینے کا نام عبادت ہے۔ انسانی زندگی کا مقصود ان قوانین کی اطاعت ہے تاکہ وہ ان کے خوشگوار نتائج سے بہرہ یاب ہو اور وہ اس زندگی میں بھی کامیاب ہو اور اس کے بعد کی زندگی میں بھی کامران۔

غور کرو بسلیم! جو معاشرہ خدا کے اس تصور کے مطابق قائم ہوگا، وہ کس قدر جنت بداماں ہوگا۔ اس میں کوئی انسان کسی دوسرے انسان پر حکومت نہیں کرے گا۔ سارا معاشرہ قوانین کے مطابق چلے گا۔ اس میں حاکم اور محکوم کا کوئی امتیاز نہیں ہوگا۔ اس معاشرہ میں ہر فرد کو پوری پوری آزادی ہوگی۔ حتیٰ کہ اس میں قانون سازی کا اختیار بھی انسانوں کو حاصل نہیں ہوگا۔ ان قوانین کے اصول وحدود، خود خدا کے مقرر کردہ ہوں گے۔

یہ تھا خدا کا وہ تصور جس کے مطابق ہمارے قرنِ اول کے عہد ہمایوں میں معاشرہ تشکیل ہوا اور اس کا نتیجہ تھی وہ جنت

ارضی جسے دوبارہ دیکھنے کے لئے آسمان کی آنکھ آجتک ترستی ہے۔

تم نے غور کیا سلیم! کہ خدا کے تصور پر انسانی معاشرہ کا دارومدار کس طرح بنیادی ہے۔ اس سے تم اندازہ لگا لو کہ قرآن نے ایمان باللہ پر اس قدر زور کیوں دیا ہے اور صفاتِ خداوندی (الاسماء الحسنیٰ) کو اس شرح وبسط کے ساتھ بیان کیوں کیا ہے۔ خدا کا تصور انہی صفات کی رو سے قائم ہوتا ہے۔ ہم ذاتِ خداوندی کا تصور کر نہیں سکتے ـــــ محدود ذہن لامحدود کا تصور نہیں کر سکتا۔ اس لئے ہمارا ایمان اس خدا پر ہے جس کی یہ صفات ہیں۔ یہی صفات ہر فرد کے اندر، علیٰ حد بشریت منعکس ہونی چاہئیں اور انہی کی نمود ہمارے معاشرہ میں ہونی چاہیئے۔

اس سے تم نے یہ بھی دیکھ لیا ہوگا سلیم! کہ محض خدا کا ماننا ان کو مومن نہیں بنا سکتا۔ خدا کے ماننے سے مراد ہے اس کی ان صفات پر ایمان لانا جو قرآن کریم میں بیان ہوئی ہیں۔ اور مقصود اس سے یہ ہے کہ ہماری زندگی اور معاشرہ میں یہ صفات منعکس ہوں۔ لہٰذا جب تک ہم خدا کے متعلق ان غیر قرآنی تصورات کو اپنے ذہنوں سے محو نہیں کر دیں گے، جنہوں نے بدقسمتی سے قرآنی تصورات کی جگہ لے رکھی ہے، ہم معاشرہ میں کوئی اصلاح نہیں کر سکیں گے۔ دنیائے مذاہب میں ہر جگہ یہی ہوا کہ ان کے ہاں خدا کے حقیقی تصورات کی جگہ ذہن انسانی کے تراشیدہ تصورات نے لے لی۔ خدا کے متعلق یہ غلط تصورات ان کے معاشرہ کی اصلاح ہونے نہیں دیتے تھے ـــــ اور صحیح تصورات اُن کے ہاں موجود نہیں تھے۔ اس لئے ان کے ہاں اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ وہ خدا کو اپنی معاشرتی زندگی سے الگ کر دیں۔ چنانچہ انہوں نے خدا کو محض پوجا پاٹ کے لئے رکھ لیا اور معاشرہ کو اپنی مصلحتوں کے مطابق تشکیل کر لیا لیکن ہماری پوزیشن ان سے یکسر مختلف ہے۔ ہمارے پاس خدا کے متعلق صحیح تصور قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے۔ اس لئے ہمیں اپنی معاشرتی اصلاح کے لئے خدا کو تیاگنا نہیں پڑیگا۔ ہم اپنے معاشرہ کو صحیح تصورات کا آئینہ بنا سکتے ہیں۔ اور اسی میں ہماری نجات وسعادت کا راز ہے۔

باقی رہا تمہارا یہ سوال کہ کیا ہمارا معاشرہ پہلے بگڑا تھا اور اس کے بگاڑ کا نتیجہ خدا کے متعلق غیر قرآنی تصورات کا پیدا ہونا تھا۔ یا پہلے خدا کے متعلق تصورات بدلے گئے اور اس کا نتیجہ معاشرہ کی بگاڑ کی صورت میں برآمد ہوا؟ اس سوال کا تعلق تاریخ سے ہے لیکن میں یہی سمجھتا ہوں کہ ہمارے ہاں پہلے خدا کے متعلق غیر قرآنی تصورات آئے اور ان کی وجہ سے معاشرہ میں خرابیاں پیدا ہوئیں۔ وہ خرابیاں اس وقت تک چلی آرہی ہیں۔ لہٰذا ان خرابیوں کے ازالہ کی ایک ہی صورت ہے۔ اور وہ یہ کہ خدا کے متعلق قرآنی تصورات کو پھر سے سامنے لایا جائے۔ تم کہو گے کہ جب یہ تصورات قرآن میں موجود ہیں تو پھر انہیں سامنے لانے میں دقت کیا ہے؟ دقت یہ ہے کہ بدقسمتی سے ہمارے مروجہ غیر قرآنی تصورات کی تائید اور سند میں بڑے بڑے بزرگوں کے اقوال پیش کر دیئے جاتے ہیں ـــــ میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ اقوال فی الواقعہ ان کے ہیں یا ان کی طرف یونہی

منسوب کر دیئے گئے ہیں۔ بات یہاں تک بھی رہتی تو خیر تھی لیکن بدقسمتی سے بعض اقوال کو منسوب کر دیا گیا نبی اکرمؐ کی ذات گرامی کی طرف ـــــ حالانکہ یہ واضح ہے کہ نبی اکرمؐ کا کوئی ارشاد گرامی قرآن کریم کے خلاف ہو ہی نہیں سکتا۔ اس لئے ایسے اقوال، جو قرآنی تصورات کے خلاف ہوں، کبھی حضورؐ کے ارشادات نہیں ہو سکتے۔ اب یہ غیر قرآنی اقوال جو اسلام کی طرف، اور خود حضورؐ نبی اکرمؐ کی ذاتِ اقدس اعظم کی طرف منسوب کردہ ہیں قرآنی تصورات کے راستے میں روک بنا دیئے جاتے ہیں۔ یہ ہے وہ دشواری جس کی وجہ سے مروجہ غیر قرآنی تصورات کی جگہ صحیح قرآنی تصورات کے لانے میں وقت حائل ہوتی ہے۔

دین کا معاملہ سلیم! بڑا نازک ہوتا ہے۔ یہ اگر دین رہے تو اس سے قوم کو دنیا اور آخرت دونوں کی خوشگوار یاں اور سرفرازیاں حاصل ہوتی ہیں۔ لیکن اگر وہ مذہب کی سطح پر آجائے ـــــ یعنی غیر خداوندی تصورات، دین کا لبادہ اوڑھ لیں ـــ تو پھر وہ قوم نہ دنیا کی رہتی ہے نہ آخرت کی۔ قوم کو اس حالت سے نکال کر دوبارہ دین تک لے جانے کا مرحلہ بڑا دشوار گزار اور ہمت طلب ہوتا ہے۔ اس کے راستے میں وہ تمام قوتیں حائل ہو جاتی ہیں جن کے مفادات مذہب کے ساتھ وابستہ ہوتے ہیں اور دین آجانے کی صورت میں وہ باقی نہیں رہتے۔ ان کی طرف سے دین کی سخت مخالفت ہوتی ہے۔ اس لئے ایسی قوم کی حالت دن بدن ابتر ہوتی چلی جاتی ہے۔ ہم بدقسمتی سے اسی ابتری کا شکار ہیں۔ اور ہم اس سے نجات حاصل نہیں کر سکتے جب تک اس اصل الاصول کو نہ مان لیا جائے کہ جو کچھ قرآن کے مطابق ہے وہ دین ہے۔ جو اس کے خلاف ہے وہ دین نہیں خواہ اسے غلطی سے کسی کی طرف منسوب کیوں نہ کر دیا گیا ہو۔ والسلام

"پرویز"

ضرورت رشتہ

ایک بتیس ۳۲ سالہ (کنوارہ) نوجوان کے لئے جو پاکستان سے باہر مستقل طور پر مقیم ہے اور جس کی کم از کم آمدنی چار ہزار روپے ماہوار سالانہ ہے۔ نیک سیرت تعلیم یافتہ۔ قرآنی فکر سے دلچسپی رکھنے والی، شریک حیات کی ضرورت ہے جو مستقل طور پر پاکستان سے باہر رہنے کے لئے تیار ہو۔ خط کے ساتھ فوٹو بھیجنا ضروری ہے۔ تمام خط و کتابت صیغۂ راز میں رکھی جائے گی۔

ک معرفت طلوعِ اسلام۔ ۲۵۔ بی گلبرگ لاہور

حقائق و نظر

جنھوں نے پاکستان کی مخالفت کی۔

سابقہ یوم قائداعظمؒ کی تقریب پر مجلس استقلالِ پاکستان کی طرف سے (جو حال ہی میں وجود میں آئی ہے) وائی۔ ایم۔ سی۔ اے۔ ہال لاہور میں ایک جلسہ منعقد ہوا۔ مقررین میں نمایاں طور پر وہ حضرات شامل تھے جو (سابقہ) مسلم لیگ سے منسلک رہ چکے ہیں ـــــ مثلاً میر خلیل الرحمٰن صاحب۔ ابو سعید انور صاحب۔ ممتاز احمد خاں صاحب۔ جلسہ میں ایک رزولیوشن پاس کیا گیا جس کی رو سے حکومت سے درخواست کی گئی کہ وہ ایک کمیشن مقرر کرے جو ان لوگوں کی فہرست مرتب کرے جنھوں نے کانگرس کے جھنڈے تلے کھڑے ہو کر مسلم لیگ کے خلاف محاذ قائم کیا تھا۔ یا جنھوں نے مسلمانانِ ہند کے حق خود ارادیت یا تشکیل پاکستان کی مخالفت کی تھی۔ ان لوگوں پر پابندی لگا دی جائے کہ وہ (۱) آئندہ کسی انتخاب میں حصہ نہ لے سکیں۔ (۲) سیاسی امور پر اظہار خیال نہ کر سکیں۔ اور (۳) ان کے جائیداد کی ملکیت کے حق کو محدود کر دیا جائے۔ (بحوالہ پاکستان ٹائمز۔ مورخہ ۲۶ دسمبر ۱۹۶۱ء)

ہمیں یہ ریزولیوشن پڑھ کر بے ساختہ غالب کا حسرت آمیز مصرعہ یاد آ گیا کہ

ہائے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا!

پاکستان کو وجود میں آئے چودہ پندرہ برس ہو گئے۔ وہ لوگ جنھوں نے تحریک پاکستان کی مخالفت کی تھی، انھوں نے پاکستان میں رہتے ہوئے اس کی تخریب اور تضعیف کے لئے جو کچھ کرنا تھا جی بھر کر کیا۔ اس دوران میں مسلم لیگ بھی پاکستان میں تھی اور اس کی حکومتیں بھی برسر اقتدار رہیں لیکن ان مخالف عناصر کی کارروائیوں کے خلاف ایک قدم بھی نہ اٹھایا گیا، حالانکہ ارباب نظم و نسق کی توجہ بار بار اس بنیادی خطرہ کی طرف منعطف کرائی گئی۔ انھیں ہر موقعہ پر جھنجوڑا گیا، برملا کہا گیا کہ ان لوگوں کی کارستانیوں سے پاکستان کی بنیادیں کھوکھلی ہو رہی ہیں۔ اس

میں انتشار پھیلایا جا رہا ہے۔ لوگوں میں یاس اور نا امیدی عام کی جا رہی ہے۔ حتیٰ کہ یہ بھی مشہور کیا جا رہا ہے کہ پاکستان بنانا بہت بڑی غلطی تھی۔ اس سے ہم تباہ ہو گئے۔ برباد ہو گئے۔ وغیرہ وغیرہ۔ لیکن کسی نے اس فتنہ کی روک تھام کے لئے کچھ نہ کیا۔

پاکستان اگست ۱۹۴۷ء میں وجود میں آیا۔ تقسیم ہند سے پہلے، حکومت کے دفاتر میں بہت سے مسلمان ایسے تھے جو نظریہ اور تحریک پاکستان کے سخت مخالف تھے۔ تقسیم کے بعد جب دفاتر کا عملہ ادھر منتقل ہو کر آیا، تو اس میں یہ پاکستان دشمن گروہ بھی اٹنڈ کرتا گیا (حالانکہ ہندوستان میں انہیں اس کا اختیار دیا گیا تھا کہ وہ جی چاہے ہندوستان میں رہیں اور جی چاہے تو پاکستان چلے جائیں)۔ دفاتر کی مشینری کے اندر یہ عنصر کس قدر خطرہ کا موجب ہو سکتا تھا۔ ظاہر ہے۔ اس کے متعلق طلوعِ اسلام نے اپنی دوسری ہی اشاعت (بابت مارچ ۱۹۴۸ء) میں حسب ذیل الفاظ میں حکومت کی توجہ مبذول کرائی۔

> حکومت ہند میں اکثر مسلمان ایسے تھے جو عمر بھر تحریک پاکستان کے مخالف اور مسلم لیگ کے دشمن رہے، یہ قومیت پرست گروہ، تمام دفاتر میں پاکستان اور لیگ کے خلاف منافرت کا زہر پھیلاتا رہتا تھا اور اپنے آقایانِ نعمت (ہندوؤں) کی قومیت کے گمنڈ پر مسلمانوں کے محبوب ترین قائدین کو ہدفِ طعن و تشنیع تک بنانے سے بھی نہیں چوکتا تھا ..... مسلمان ان آستین کے سانپوں کے ہاتھوں سخت نالاں تھے جو صولِ پاکستان کے بعد یہ امکان نظر آتا تھا کہ اب قوم ان غداران ملت کی روباہ بازیوں سے مخلصی حاصل کرے گی لیکن اس "مسلمانِ عام" سے یہ ہوا کہ یہ تمام قومیت پرست عنصر، پاکستان آ پہنچا اور دفاتر میں مختلف کرسیوں پر متمکن ہو گیا۔ اب سنئے یہ ہیں کہ یہی "رکن پنجم" (FIFTH COLUMN) حکومتِ پاکستان کی مشینری میں معتبر اور معتمد علیہ بنے ہوئے ہیں اور چونکہ ان پاکستانی ملازموں کو پہلے سے اس امر کی ضمانت دیدی گئی تھی کہ ان کے جملہ حقوقِ ملازمت محفوظ رہیں گے اس لئے یہ گروہ منافقین، خنجر در آستین، اپنی زہر افشانیوں میں بدستور مصروف ہے۔ ہم تو اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ یہاں بدعنوانیوں اور سرکشیوں کے جو مظاہرے ہوتے رہتے ہیں۔ وہ اکثر و بیشتر اسی گروہ کی انگیخت کا نتیجہ ہوں گے۔ یہ گروہ اپنے ساتھ ایک خاص مقصد لے کر آیا ہے اور اس مقصد کے حصول کے لئے ہر وقت مصروفِ کار رہتا ہے۔ کبھی ناصحین مشفق کے لباس میں اور کبھی ناقدینِ مصلح کے نقاب میں، یہ لوگوں کے حوصلوں (MORALE) کو پست کرنے اور

ٹھنڈی آہیں بھر بھر کر انہیں پاکستان اور اربابِ حل و عقد کے خلاف ورغلانے اور بھڑکانے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتا۔ دنیا میں ہر ملازم رکھنے والے کو یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ صرف اس شخص کو ملازم رکھے جس پر اسے پورا پورا اعتماد حاصل ہو اور جو اس کے کاروبار اور نظم و نسق کو نقصان پہنچانے کا موجب نہ ہو۔ چنانچہ اسی اصول کے مطابق تمام حکومتیں، صرف ان لوگوں کو شریکِ کار بناتی ہیں جن کے احوال و ظروف اور میلانات و عواطف کی انہوں نے چھان بین کر لی ہوتی ہے لیکن یہاں یہ ہوا ہے کہ وہ لوگ جن کے متعلق برسوں کے عینی مشاہدہ نے بتا رکھا تھا کہ یہ پاکستان کے پکے دشمن ہیں ان سب کو بلا تخصیص شاملِ دفاترِ حکومت کر لیا گیا ہے اور ہمیں معلوم ہوا ہے کہ نہایت ذمہ داری کے کام اُن کے سپرد ہیں اور چونکہ ان کے حقوقِ ملازمت کے تحفظ کی بھی ضمانت دیدی گئی ہے اس لئے وہ بے خوف و خطر اپنے مشن کی تکمیل میں مصروف رہ سکتے ہیں۔

اس سے اگلی اشاعت (بابت اپریل ۱۹۴۸ء) میں ہم نے "سرحدی گاندھی" کے اقدامات کی طرف حکومت کی توجہ ان الفاظ میں منعطف کرائی۔

سابقہ اشاعت میں ہم نے "محاسبۂ نفس" کے زیرِ عنوان ضمناً یہ بھی لکھا تھا کہ نیشنلسٹ مسلمان کس طرح خاموشی سے نظم و نسق حکومت میں دخیل ہو رہے ہیں اور اس طرح مملکتِ پاکستان کے لئے ایک مستقل خطرہ کا موجب بن رہے ہیں۔ یہ وہ طبقہ ہے جو زیرِ نقاب اپنے مشن کی تکمیل میں مصروفِ کار ہے۔ لیکن ان ہی کا ایک گروہ ایسا بھی ہے جو ایک دوسری شکل میں پاکستان کی تخریب کیلئے سرگرمِ عمل ہے۔ اس گروہ کا سرخیل، سرحدی گاندھی عبدالغفار خاں ہے۔ یہ خان صاحب جب مجلس دستور ساز پاکستان کے اجلاس میں شمولیت کے لئے عازمِ کراچی ہونے والے تھے تو ہمارا ماتھا ٹھنکا تھا کہ نہ معلوم اب یہ مسلمانوں کے لئے کیا نئی مصیبت پیدا کریں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ انھوں نے یہاں پہنچ کر سب سے پہلے تو اسی "پٹھانستان" کا مطالبہ پیش کیا جسے ہندو کی اسلام دشمنی نے تقسیمِ ہند سے پہلے تشکیلِ پاکستان کی راہ میں ایک سنگِ گراں کی حیثیت اختیار کرنے کے لئے وضع کیا تھا اور جسے ریفرنڈم کے موقعہ پر مسلمانانِ سرحد میں تشتت و افتراق پیدا کرنے کے لئے بطور آلۂ حرب استعمال کیا تھا۔ اس وقت یہ آلۂ حرب جس قدر ناکام ثابت ہوا اس کے پیشِ نظر ہمارا خیال تھا کہ سرحدی گاندھی صاحب اسے دوبارہ میدانِ جنگ میں نہیں

لائیں گے لیکن وہ اپنی بندوق میں پہلے ایک تازہ کارتوس لانے (جس کا ذکر آگے چل کر آئے گا) اس چلے ہوئے کارتوس کو بھی ساتھ اٹھا لائے کہ شاید کوئی سادہ لوح اس کا بھی شکار ہو جائے۔

اس کے ساتھ ہی ہم نے حکومت کی توجہ اشتراکیت کے خطرہ کی طرف بھی مبذول کرائی۔ اور اس ضمن میں لکھا۔

ہم حکومت کو ایک بار پھر متنبہ کر دینا چاہتے ہیں کہ انھوں نے جمہوریت کا یہ مفہوم بالکل غلط سمجھا ہے کہ جن لوگوں کے متعلق یقینی طور پر معلوم ہے کہ وہ مملکت پاکستان کے کس قدر گہرے دشمن ہیں، انہیں پاکستان دوستی کے منافقانہ دعاوی کی آڑ میں اس قسم کی سازشوں کی اجازت دی جائے جس سے اس نوزائیدہ نظام کی بنیادیں متزلزل ہو جائیں۔ ضرورت ہے کہ جو نیشلسٹ عنصر نظم و نسق امورِ سلطنت میں کسی نہ کسی طرح دخیل ہو گیا ہے۔ یا جو کمیونسٹ عنصر (حقیقی یا مزعوم) عوام کو آئین شکنی اور امن سوزی کے لئے بھڑکاتا ہے، اور مظاہرات اور اشتعال انگیز اسباب و ذرائع سے حکومت کی مشینری میں رخنے ڈالنے کی کوشش کرتا ہے۔ آہنی گرفت سے اس کا مقابلہ کیا جائے تاکہ قبل اس کے کہ اس کی جڑیں زمین گیر ہو جائیں۔ اس فتنہ کا استیصال ہو جائے۔ ابھی ہماری نوترتیب یافتہ مملکت اس قسم کی سازشوں کی حریف نہیں ہو سکتی۔

ہماری ان مخلصانہ گزارشوں کا اتنا اثر ضرور ہوا کہ اس حقیقت کا احساس ہمارے ذمہ دار عمائدین کے حلقہ میں پیدا ہونا شروع ہوا۔ چنانچہ اس کی ابتداء خود قائدِ اعظم کی طرف سے ہوئی۔ انھوں نے مارچ ۱۹۴۸ء میں ڈھاکہ کی تقریر میں فرمایا۔

میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ ہمارے اندر وہ لوگ موجود ہیں جو بیرونی قوتوں سے مالی امداد حاصل کر کے پاکستان کے درپے تخریب ہیں۔ میں آپ کو آگاہ کرنا چاہتا ہوں کہ آپ ان سے ہوشیار رہیں اور ان کے دلکش نعروں اور جاذب توجہ وعدوں کے فریب میں نہ آجائیں۔

(طلوعِ اسلام۔ مئی ۱۹۴۸ء)

دوسری طرف کراچی میں وزیر خزانہ، غلام محمد (مرحوم) نے ایک پریس کانفرنس میں کہا۔

مجھے یقین ہے کہ ملازمین کا طبقہ دل کا کھرا ہے لیکن ان پر ایک ایسا طبقہ اثر انداز ہو رہا ہے جو ہماری معاشرتی زندگی کا دشمن اور بیرونِ پاکستان قوتوں کا آلۂ کار ہے۔ حکومت کو بعض ایسی جماعتوں کی سرگرمیوں کا علم ہے جن کا مقصد یہ ہے کہ وہ سرکاری ملازمین کو حکومت کے لئے مشکلات پیدا کرنے کے لئے اکسائیں۔ ان میں سے بعض ہمارے معاشرتی نظام کے دشمن اور تشدد آمیز انقلاب کے

حامی ہیں..... ان میں سے بعض کے متعلق ہمیں حتمی طور پر معلوم ہے کہ وہ باہر سے ہدایات حاصل کرتے ہیں۔ کوئی حکومت بھی ایسے عناصر کے وجود کو برداشت نہیں کر سکتی۔ ہمارے ملازمین حکومت کو محتاط رہنا چاہیئے کہ وہ اس قسم کے لوگوں کے دامِ فریب کا شکار نہ ہو جائیں۔

اور وزیرِ اعظم لیاقت علی خاں (مرحوم) نے ۱۴ اپریل کو اپنے ایک بیان میں کہا۔

بعض سازشی گروہ (عنصرِ پنجم) ملازمین حکومت کی مشکلات سے ناجائز فائدہ اٹھا کر انھیں اپنے مقاصد براری میں استعمال کرنا چاہتے ہیں لیکن وہ اپنے مشئومہ عزائم میں کامیاب نہیں ہو سکتے کیونکہ ملازمین کے دل میں کھوٹ نہیں۔ وہ انتہائی کوشش کر رہے ہیں کہ ملازمین میں انتشار اور سرکشی پیدا کر کے نظامِ حکومت کو مفلوج کر دیں مجھے یقین ہے کہ ملازمین حکومت کی غالب اکثریت ان لوگوں کی فتنہ سامانیوں سے آگاہ ہے۔

خاں صاحب (مرحوم) نے ۱۴ اگست کو اپنی نشری تقریر میں پھر اس خطرہ کو دہرایا، تو طلوعِ اسلام نے کہا کہ

ارباب حکومت نے اب تک ملک و ملت کو یہ نہیں بتایا کہ ایسے دشمنانِ ملک و ملت کون ہیں؟ وہ کیا کر رہے ہیں؟ خود حکومت ان کے استیصال کے لئے کیا کر رہی ہے، اور ملت کیسے ان کے دامِ فریب کا شکار ہونے سے بچ سکتی ہے۔ (طلوعِ اسلام۔ ستمبر ۱۹۴۸ء)

طلوعِ اسلام کی اسی اشاعت (بابت ستمبر ۱۹۴۸ء) میں ہم نے ان لوگوں کا خاص طور پر ذکر کیا تھا جو تقسیم ہند سے پہلے بر بنائے مذہب تحریک پاکستان کی سب سے زیادہ مخالفت کیا کرتے تھے اور جو تشکیلِ پاکستان کے بعد مذہب ہی کے نقاب میں یہاں انتشار پھیلانے کے "جہادِ عظیم" میں مصروف تھے۔

اس سے اگلی اشاعت (بابت اکتوبر ۱۹۴۸ء) میں ہم نے، ان تمام تخریبی عناصر کا عمومی ذکر کرنے کے بعد لکھا۔

ہم نے بارہا عمائدینِ حکومت سے نوزائیدہ مملکتِ پاکستان تحفظ و بقاء کا واسطہ دے کر گزارش کی ہے کہ وہ دشمن کے اجیروں اور رکنِ پنجم کے ان عناصر کے محض ضمنی تذکروں پر ہی اکتفا نہ کریں بلکہ انھیں آشکارا کر کے ان کی بداندیشیوں اور شورش انگیزیوں کو ختم کرنے کے لئے سخت اور مؤثر اقدامات کریں تاکہ ملت ان کے ناموں کے علاوہ ان کا انجام بھی دیکھ سکے۔ حکومت کی غفلت سے ان کی سرگرمیاں تیز تر ہوتی گئیں۔ اس کے ساتھ ہی ہندوستان کے ذمہ دار اشخاص اور اخبارات نے ان تخریبی کارروائیوں کے متعلق جن جذبات کا اظہار کیا اُن سے یہ حقیقت ایک بار پھر نکھر کر سامنے آگئی کہ پاکستان میں آزادیٔ تحریر و تقریر کے جمہوری حق کا ناجائز استعمال کرنے والوں کو کس کی

چشم تہ ابرو کا اشارہ مل رہا ہے۔

یہ کچھ ہم نے طلوعِ اسلام کی اشاعت کے سال اول میں لکھا تھا۔ اس کے بعد بھی ہم، ہر موقعہ پر ارباب حل و عقد کی توجہ اس خطرہ کی طرف مبذول کراتے رہے۔ لیکن ان کی طرف سے اس کی روک تھام کے لئے کوئی موثر قدم نہ اٹھایا گیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ خطرہ ملک میں اپنی جڑیں پکڑ گیا۔ اب مجلس استقلال نے اپنے ریزولیوشن میں اسی بات کو دہرایا ہے۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ اب اس کا وقت نکل چکا ہے۔ اب اس قسم کی فہرستیں مرتب کرنے سے کیا حاصل ہوگا؟ اب تو اس کی ضرورت ہے کہ حکومت یہ دیکھے کہ پاکستان بننے کے بعد کون کون سی پارٹیاں ملک میں خلفشار پیدا کرنے اور اس طرح پاکستان کی تیاریوں کو کمزور کرنے کا موجب بنتی رہی ہیں۔ ان کے کارپردازان پر کڑی نگاہ رکھی جائے اور انہیں پھر سے طاقت پکڑنے کا موقعہ نہ دیا جائے۔

ان کے علاوہ ملک کے لئے سب سے بڑا خطرہ کمیونزم کا ہے۔ یہ آتش خاموش کی طرح آگے بڑھا کرتا ہے۔ اس کی روک تھام کے لئے خاص جد و جہد کی ضرورت ہوگی۔

لیکن یہ ساری ذمہ داری حکومت کے سر ڈال کر ہمیں اطمینان سے نہیں بیٹھ جانا چاہیئے۔ یہ ملک کے تمام بہی خواہوں کا مشترکہ فریضہ ہے جس کی ادائیگی کی ذمہ داری حکومت اور ملت دونوں پر یکساں عائد ہوتی ہے۔

علامہ احمد امین مصری (مرحوم) کی
علمی اور تاریخی کاوشوں کا شاہکار

فجر الاسلام

جسے مولانا عمر احمد عثمانی نے اردو زبان میں منتقل کیا

اس دور کی علمی حرکات اور تہذیبی کیفیات کا تفصیلی جائزہ جب آفتابِ اسلام کی جلوہ باریوں نے بزم انسانی کو منور کیا

ضخامت نو سو صفحات ——— قیمت آٹھ روپے

میزان پبلیشرز لمیٹڈ ۔ ۲۔ بی۔ شاہ عالم مارکیٹ لاہور

کیا خدمتِ دین کا معاوضہ لینا جائز ہے؟

(ایک غور طلب بحث)

(محترم سید نصیر شاہ صاحب میانوالی)

حضور سرورِ کائنات کے بعد سلسلۂ نبوت کا اختتام ہو چکا ہے۔ اب قیامت تک کوئی ایسا انسان پیدا نہیں ہوگا جو خدا سے ہمکلام ہو اور براہِ راست آسمانی ہدایت حاصل کر سکے۔ قرآن حکیم کو قیامت تک کے لئے محفوظ کر دیا گیا ہے تاکہ ہر زمانہ میں امتِ مسلمہ غور کے اس معیار سے ہدایت حاصل کر کے فریضۂ تبلیغ ادا کرتے رہے۔ یہ فریضہ فی الواقع ایسا اہم بالشان ہے۔ جو انبیاء کرامؑ ادا کیا کرتے تھے اسی لئے تو اس امت کو وارث کتاب مبین قرار دیا گیا ہے۔

ظاہر ہے کہ انبیائے کرامؑ وہ نفوسِ قدسیہ تھے جو اپنے ترکہ میں مال و دولت کے ڈھیر اور جائیدادوں کی طویل فہرستیں نہیں چھوڑ گئے۔ ان کا ورثہ تبلیغ حق ہے۔ اور ان حسین راہوں پر ان کے نقوش تابندہ ستاروں کی طرح ثبت ہیں جن کی خنک و سیمیں روشنی میں امتِ مسلمہ اپنی راہیں متعین کر سکتی ہے۔

ان برگزیدہ ہستیوں نے اعلانِ حق میں رائے عامہ کی کوئی پرواہ نہ کی۔ انھوں نے یہ بھی نہ دیکھا کہ ان کی حق گوئی سے اقتدار کی پیشانی شکن آلود ہو رہی ہے۔ انھوں نے دعوتِ حق کے جانکاہ مراحل میں پیٹ پر پتھر باندھے جسمانی عذاب کی جان لیوا صعوبتیں برداشت کیں، گھر بار، بیوی بچے، اور خویش و اقارب کو چھوڑا۔ اپنوں کی دشمنی مول لی۔ بیگانوں کے تیر سہے۔ مگر بُرا چاہنے والوں کا بھلا چاہنے سے بالکل نہ رُکے۔

قرآن اور اُجرتِ تبلیغ ظاہر ہے کہ جو عظیم فریضہ اس خلوصِ نیت سے ادا کیا جائے اس کے بدلہ میں اجرت طلب کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آخر یہ کیسے ممکن ہے کہ شمعِ صداقت کے پروانے اتنے پاکیزہ فرض

کو سرانجام دے کر اس کے معاوضہ کے طلبگار ہوتے۔ کیا اس کا تصور بھی کیا جا سکتا ہے کہ وہ دینی بلند مرتبت قربانیوں کو چند سکوں کے عوض بیچ دیتے؟ نہیں ایسا کبھی نہیں ہوا۔ انبیاء علیہم السلام کی زبان سے خدا نے بار بار کہلوایا کہ وہ تبلیغ حق پر اجرت کے طالب نہیں ـــــ حضرت نوح علیہ السلام اعلان کرتے ہیں۔

يٰقَوْمِ لَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مَالًا ۭ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَي اللّٰهِ (سورۂ ہود)

اے میری قوم کے لوگو میں تم سے تبلیغ کے صلہ میں زر و مال کا طالب نہیں میرا اجر تو اللہ پر ہے۔

جناب ہود علیہ السلام فرماتے ہیں۔

يٰقَوْمِ لَآ اَسْـَٔلُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ ۭ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَي الَّذِيْ

اے میری قوم کے لوگو میں تم سے اجرت کا طالب نہیں میرا اجر تو اللہ پر ہے

حضرت صالح علیہ السلام کا اعلان ہے۔

وَمَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰي رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

بعینہٖ یہی الفاظ حضرت شعیبؑ اور حضرت لوطؑ کی زبانی نقل کئے گئے ہیں۔ نیز ان ہی اعلانات کو بار بار اس قدر زور سے دہرایا گیا ہے کہ ان کی اہمیت ذہن نشین ہو جاتی ہے۔ خود حضور سرورِ عالم کی زبانِ مبارک سے بار بار یہی اعلان کیا گیا ہے

فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَمَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ

پس اگر تم نے پیٹھ پھیر لی تو میں نے تم سے کچھ اجرت تو طلب نہیں کی تھی

مَآ اَسْـَٔلُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِيْنَ

میں تم سے تبلیغ پر کوئی اجرت طلب نہیں کرتا اور نہ ہی میں بناوٹ کرنے والوں میں سے ہوں۔

قُلْ مَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِلَّا مَنْ شَاۗءَ اَنْ يَّتَّخِذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ۝

فرما دیجئے کہ میں تبلیغ حق کے بدلہ میں تم سے کوئی اجرت نہیں مانگتا۔ میرا اجر یہی ہے کہ جو چاہے وہ اللہ کا راستہ اختیار کرے

سورۂ یٰسٓ میں ایک مردِ مومن کا قول نقل کیا گیا ہے۔

اِتَّبِعُوْا مَنْ لَّا يَسْـَٔلُكُمْ اَجْرًا وَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ۝

تم ایسے لوگوں کی پیروی کرو جو تم سے تبلیغ پر اجرت نہیں مانگتے اور وہ ہدایت پر ہیں

قرآن حکیم کے ان اعلانات سے واضح ہے کہ اللہ کی طرف سے عاید کئے ہوئے فریضہ کی اجرت دنیاوی دولت

نہیں ہو سکتی۔

احادیث اور اجرتِ تبلیغ

یہ تو تھی قرآن حکیم کی صراحت۔ اب احادیث کی طرف آیئے۔ یہاں بھی آپ کو قدم قدم پر حضورؐ کے وہ اقوال ملیں گے جو صراحتاً اجرت علی التبلیغ سے ممانعت کرتے ہیں۔

مشکوٰۃ کی روایت ہے۔

حضرت جابرؓ کہتے ہیں۔ ہم قرآن پڑھ رہے تھے کہ حضورؐ تشریف لائے ہم میں عربی بھی تھے اور عجمی بھی (جو مخارج کو اچھی طرح ادا نہیں کر رہے تھے) حضورؐ نے فرمایا پڑھتے رہو سب کچھ درست ہے۔ بعد کے زمانہ میں ایسے لوگ آئیں گے جو مخارج تو خوش اسلوبی سے ادا کریں گے مگر اس دنیا میں اجرت قرآن لینے میں جلدی کریں گے۔ اور آخرت میں اپنے لئے کچھ نہ چھوڑیں گے۔

(مشکوٰۃ۔ کتاب فضائل القرآن فصل ۳ صا۱۹)

(۲) عن عبد الرحمٰن ابن شبل عن النبی صلعم قال اقرؤ القرآن ولا تغلو فیہ ولا یجفوا عنہ ولا تاکلوا بہ ولا تستکثروا بہ۔ (مسند احمد۔ فتاوی۔ جلد ۲)

عبدالرحمٰنؓ بن شبل سے روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا قرآن پڑھو مگر اس میں غلو نہ کرو نہ اس سے دور رہو نہ اس کے عوض کچھ کھاؤ نہ مال جمع کرو۔

(۳) شمس الائمہ سرخسیؒ نقل کرتے ہیں۔

قال صلعم لمدرس العلم ایاک والخبز الرقاق والشرط علی کتاب اللہ تعالیٰ۔

(مبسوط جلد ۱۶، ص۳۷)

آنحضرتؐ نے ایک مدرس علم دین سے کہا تم اپنے آپ کو تعلیم دین کے بدلے پتلی پتلی چپاتیاں کھانے اور کتاب اللہ پر اجرت لینے سے بچاؤ۔

(۴) ترمذی شریف میں ہے کہ حضرت عمرانؓ بن حصین نے ایک مرتبہ ایک واعظ کو دیکھا جو قرآن پڑھتا تھا اور ساتھ ہی سوال بھی کرتا تھا آپ نے یہ بدعت دیکھ کر انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھا اور کہا میں نے حضورؐ انور کا یہ فرمان سنا ہے۔

من قرء القرآن فلیسأل اللہ بہ سیجیئ اقوام یقرؤن القرآن ویسألون بہ الناس۔

(ترمذی بحوالہ مشکوٰۃ)

جو قرآن پڑھے اسے چاہیئے کہ اپنی حاجات اللہ سے مانگے عنقریب ایسے لوگ آئیں گے جو قرآن اور اس کے بدلے لوگوں سے سوال کریں گے۔

علامہ دوازدہ علیہ الرحمۃ حاشیہ میں اس حدیث کے تحت لکھتے ہیں۔

"یہ لوگ چاہے صراحتاً مانگ لیں یا سائلوں کی سی صورت بنا کر زبانِ حال سے مانگیں ہر حال بُرے ہیں"

حضرت بریدہؓ روایت کرتے ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا۔

من قرأ القرآن یتأکل بہ الناس جاء یوم القیامۃ ووجہہ عظم لیس علیہ لحم

(بیہقی بحوالہ مشکوٰۃ)

جو شخص قرآن پڑھتا ہے اور اس کا معاوضہ لوگوں سے کھاتا ہے وہ قیامت کے دن اس حالت میں اٹھے گا کہ اس کا چہرہ گوشت سے خالی ہوگا صرف ہڈیاں ہوں گی۔

شارحین اس کے متعلق لکھتے ہیں۔

یہ سزا اس شخص کو ملے گی جو قرآن جیسی پُرعظمت چیز کو دنیاوی مال و دولت جیسی حقیر چیز کے حصول کا ذریعہ بنائے۔ پس خدا ایسی قبیح صورت میں اس کا حشر کرے گا۔ (مرقات شرح مشکوٰۃ)

ابی بن کعبؓ سے ایک روایت ہے جو پوری صراحت کے ساتھ ہر اس چیز کو حرام قرار دیتی ہے جس میں معاوضہ قرآن کا ذرا سا شائبہ بھی ہو۔

(۶) عن ابی بن کعب قال علمت رجلا القرآن فاھدی الی قوسا فذکرت ذلک النبی صلعم فقال ان اخذتھا اخذت قوسا من نار فردوھا۔ (ابن ماجہ)

ابی بن کعبؓ سے روایت ہے کہ میں نے ایک آدمی کو قرآن پڑھایا تھا۔ اس نے مجھے ہدیۃً ایک کمان دی میں نے حضورؐ سے ذکر کیا تو آپؐ نے فرمایا اگر تو نے کمان لی ہے تو گویا آگ کی کمان لی ہے میں نے یہ فرمان سنا تو کمان لوٹا دی۔

جہاد فی سبیل اللہ کے متوالے چونکہ تلوار اور کمان جیسے ہتھیاروں کو ہی سب سے بڑا تحفہ سمجھتے تھے اس لئے بالکل اسی قسم کا واقعہ حضرت عبادہؓ بن صامت کو بھی پیش آیا۔ اس روایت میں معاوضہ قرآن وصول کرنے پر سخت ترین سزا کا ذکر ہے۔

(۷) عن عبادۃ بن الصامت قال قلت یا رسول اللہ رجل اھدی الی قوسا ممن کنت اعلم الکتاب والقرآن ولیست بمال فارمی علیھا فی سبیل اللہ قال کنت تحب ان تطوق طوقا من النار فاقبلھا۔ (ابوداؤد۔ ابن ماجہ)

حضرت عبادہؓ بن صامت کہتے ہیں میں نے دربار رسالت میں حاضر ہو کر عرض کیا یا رسول اللہ ایک شخص کو میں پہلے قرآن پڑھایا کرتا تھا اس نے ہدیہ کے طور پر مجھے ایک کمان بھیجی ہے۔ اے اللہ کے رسولؐ یہ کوئی مال تو ہے نہیں (جسے اجرت شمار کیا جائے) میں اس سے کوئی بھی کام بھی نہ لوں گا بلکہ جہاد فی سبیل اللہ میں تیراندازی کروں گا۔ سرورِ کائنات نے فرمایا کہ اگر تم یہ چاہتے ہو کہ تمہاری گردن میں دوزخ کی آگ کا طوق پڑے تو خوشی سے اس ہدیہ کو قبول کر لو۔

کیسی پُرخلوص اور بے طمع تعلیم ہے کہ ایک ایسا طالب علم جواب زیر تعلیم بھی نہیں بغیر یہ ظاہر کئے کہ یہ کوئی معاوضہ ہے اور بغیر مانگے ایک کمان نذر کرتا ہے۔ یہ کوئی مال بھی نہیں اور اسے استعمال بھی جہاد فی سبیل اللہ جیسے مقدس فریضہ میں کرنا ہے حضرت عبادہ اپنی طرف سے وضاحت بھی کرتے ہیں کہ یہ کوئی مال بھی نہیں اس سے ظاہر ہے کہ مال لینا تو پہلے بھی حرام سمجھتے تھے۔ ایسی چیز جو جہاد میں استعمال ہو سکتی ہے اُسے لینے میں با تو کچھ حرج محسوس نہیں کرتے اور با خلجان میں پڑ کر حضورؐ سے سوال کرتے ہیں حضورؐ سختی سے منع فرماتے ہیں تاکہ اس ایک کمان کو حجت پکڑ کر بعد میں آنے والے دین کو ذریعۂ معاش نہ بنا لیں۔

ایک اور روایت میں آپ نے اذان تک کی اجرت کو حرام کہا ہے۔

(۲) عن عثمانؓ بن ابی العاص قال قلت یا رسول اللہ صلعم اجعلنی امام قومی قال انت امامهم واقتد باضعفهم واتخذ مؤذنا لا یاخذ علی اذانه اجرا۔

(ابو داؤد و نسائی۔ مشکوٰۃ)

حضرت عثمان بن ابی العاصؓ سے روایت ہے کہ میں نے حضورؐ سے کہا کہ اے اللہ کے رسول مجھے اپنی قوم کا امام مقرر فرما دیجئے۔ آپ نے فرمایا تو امام ہے مگر کمزوروں کا خیال رکھنا (طوالت قرأت سے انہیں تکلیف نہ دینا) اور ایسا مؤذن مقرر کرنا جو اجرت نہ لے۔"

اس حدیث سے واضح ہے کہ حضورؐ نے امامت کی اجرت کی حرمت کو مسلمہ سمجھ کر اس سے ادنیٰ درجہ کی خدمت یعنی اذان پر اجرت لینے سے منع فرمایا۔

تعاملِ صحابہؓ

قرآن کی نصوص اور حدیث کی صراحتوں کے بعد تعاملِ صحابہؓ پر غور کیجئے۔

عن یحیی البکاء ان رجلا قال لابن عمر انی احبک فی اللہ فقال له ابن عمر لکنی ابغضک فی اللہ لانک تاخذ علی الاذان اجرا۔ (شرح معانی الآثار۔ طحاوی کتاب الاجارات جلد ۲ صفحہ ۲)

یعنی بجائے روایت ہے کہ ایک شخص نے ابن عمرؓ سے کہا میں آپ سے خدا کے لئے محبت کرتا ہوں آپ نے جواب دیا لیکن میں تم سے خدا کے لئے بغض رکھتا ہوں کیونکہ تو اذان پر اجرت لیتا ہے۔

بالکل اسی طرح کی روایت جناب فاروق اعظمؓ کے متعلق بھی مروی ہے۔

شمس الائمہ سرخسیؒ لکھتے ہیں۔

"ایک شخص نے حضرت فاروق اعظمؓ کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا مجھے آپ سے محبت ہے۔ آپؓ نے جواب دیا میں تم سے عداوت رکھتا ہوں۔ اس شخص نے پوچھا لمہ یا امیر المومنین (کیوں یا امیر المومنین) آپ نے فرمایا۔ بلغنی انک تاخذ علی الاذان اجرا (مجھے یہ خبر ملی ہے کہ تم اذان پر اجرت لیتے ہو)۔ (المبسوط جلد ۱۶۔ کتاب الاجارۃ صفحہ ۳)

ائمہ اربعہ کا فتویٰ

ائمہ کرام کا فتویٰ بھی قرآن، حدیث اور تعامل صحابہؓ کے عین مطابق ہے۔ حضرت عبادہ بن الصامتؓ کی روایت کو دلیل بنا کر حضرت امام اعظم ابو حنیفہؒ تعلیم قرآن کی اجرت کی حرمت کا فتویٰ دیتے ہیں۔ چنانچہ اسی روایت کے حاشیہ پر یہ عبارت درج ہے۔

فی ھذا الحدیث تھدید و وعید بدال علی تحریم اخذ الاجرۃ علی تعلیم القرآن واحتج بہ ابو حنیفہ۔ (حاشیہ مشکوٰۃ باب الاجارہ)

اس حدیث میں سخت ڈراوا ہے اور عذاب کی دھمکی ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ تعلیم قرآن کی اجرت حرام ہے امام اعظمؒ نے اسی حدیث کو دلیل بنا کر اجرت تعلیم قرآن کی حرمت کا فتویٰ دیا۔

علامہ عبدالرحمٰنؒ الجزائری لکھتے ہیں۔

اما الاجارۃ علی الطاعات فاصول مذھب حنیفہ تقتضی انھا غیر صحیحۃ لان کل طاعۃ یختص بھا المسلم لایجوز الاستئجار علیھا۔ ویستدلون بحدیث روی عنہ علیہ السلام اقرؤا القرآن ولا تاکلوا بہ۔ وقد عھد عمر الی عمرو بن العاص ان اتخذت مؤذنا فلا یاخذ علی الاذان اجرا۔ اخذ اھو اصل مذھبھم۔ (الفقہ علی المذاہب الاربعہ جزو ۳ قسم المعاملات صفحہ ۱۶۹-۱۷۰)

حنفی مذہب میں عبادت پر اجرت لینا صحیح نہیں کیونکہ ہر وہ طاعت جو مسلمانوں کے ساتھ مخصوص ہو اس پر اجرت لینا جائز نہیں۔ اور وہ اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں جس میں حضورؐ نے فرمایا "قرآن پڑھو مگر اس کے بدلے کچھ نہ کھاؤ"۔ نیز اس روایت سے حجت پکڑتے ہیں جس میں ہے کہ جناب فاروق اعظمؓ نے عمرو بن العاصؓ کو کہا کہ ایسا مؤذن مقرر کرنا جو اذان پر اجرت نہ لے۔ یہی مذہب حنفیہ کی اصل ہے۔

حضرت امام شافعیؒ بھی اجرت علی الطاعات فی نفسہ کے خلاف ہیں۔

ولا تصح الاجارۃ علی الطاعات التی تجب لھا کالصلوٰۃ فرضاً کانت او نفلاً۔ لا تصح الاجارۃ علی التدریس۔ (ایضاً ص۱۸۸)

جو عبادات فرض ہیں ان پر اجرت لینا صحیح نہیں جیسے نماز خواہ فرضی ہو، خواہ نفلی اسی طرح تدریس دین پر بھی اجرت جائز نہیں۔

امام احمد بن حنبلؒ بھی ایسی اجرت کو جائز نہیں سمجھتے۔

لا یصح الاجارۃ علی فعل قربت اللہ تعالیٰ کالحج والصلوٰۃ والاذان والامامۃ وتعلیم القرآن والفقہ والحدیث۔ (ایضاً۔ ص۱۹۵)

جو افعال قرب الٰہی حاصل کرتے ہیں ان پر اجرت جائز نہیں جیسے حج، نماز، اذان، امامت، تعلیم قرآن، تعلیم فقہ، تعلیم حدیث۔

امام مالکؒ اسے مکروہ قرار دیتے ہیں۔

الاجرۃ علی تعلیم الفقہ والفرائض فانھا مکروھۃ لان الفرض نشر العلوم الدینیۃ واخذ الاجرۃ علیہ معطل فی الجملہ فلذا کانت مکروھۃ۔ (ایضاً۔ ص۱۸۵)

فقہ اور فرائض کی تعلیم پر اجرت مکروہ ہے کیونکہ دینی علم کی نشر و اشاعت فرض ہے اور اجرت لینے سے اس میں تعطل واقع ہو جاتا ہے۔ پس یہ مکروہ ہے۔

صاحبینؒ کا فتویٰ

امام اعظمؒ کے ساتھ ان کے شاگردانِ رشید قاضی ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ بھی اسے ناجائز سمجھتے ہیں۔ امام طحاویؒ نے باب التزویج اور باب الاستیجار علی القرآن میں متعدد احادیث اور عقلی دلائل سے اس کی حرمت ثابت کی ہے۔ ایک دلیل یہ بھی دی ہے کہ حضورؐ پر بلغ ما انزل من ربک کے حکم کے مطابق تبلیغ فرض تھی اسی طرح بحکم حدیث بلغوا عنی ولو کان آیۃ سب امت پر اور خصوصاً علمائے کرام پر تبلیغ بے اجرت فرض ہے۔ اس تمام طویل بحث کے بعد امام موصوف اختتام پر یہ الفاظ درج کرتے ہیں۔

ھذا کلہ قول ابی حنیفۃ وابی یوسف ومحمد رحمھم اللہ۔ (شرح معانی الآثار)

یہ تمام اقوال ابو حنیفہؒ ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کے ہیں۔

دوسرے ائمہ کا فتویٰ

صرف انہی حضرات پر کیا موقوف ہے۔ تمام ائمہ اس کے خلاف تھے۔ علامہ شوکانیؒ لکھتے ہیں۔

وقد استدل باحادیث الباب من قال انها لا تحل الاجرة على تعليم القرآن وهو احمد بن حنبل واصحابه وابوحنيفة والهادويه وبه قال عطا والضحاك بن قيس والزهري واسحٰق وعبد الله بن شقيق ۔ (نیل الاوطار جلد ۵ ۔ ص۲۸۳)

انہی احادیث سے ان لوگوں نے استدلال کیا جو اجرت علی تعلیم القرآن کو حلال نہیں سمجھتے اور وہ ہیں امام احمد بن حنبلؒ اور ان کے اصحاب، امام ابوحنیفہؒ ہادویہؒ، عطاؒ، ضحاکؒ، زہریؒ، اسحٰقؒ عبداللہ بن شقیق ۔

امام حسن بصریؒ کا قول ہے کہ جو علماء دین کے بدلے دنیا حاصل کرتے ہیں ان سے جنگل کے حیوان اچھے ہیں جو گھاس چرتے پھرتے ہیں مگر دین کو پیٹ بھرنے کا ذریعہ نہیں بناتے ۔

امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ جو عالم علم دین کے عوض دولت طلب کرتا ہے وہ ایسا ہے گویا اس کے سر سے غلاظت بہ رہی ہے ۔

علمائے متقدمین کا فیصلہ

متذکرہ آیات واحادیث اور اقوال ائمہ کی بنا پر علمائے متقدمین نے بھی ایسی اجرت کو ناجائز قرار دیا ہے ۔ علامہ ابوالحسین قدوریؒ بہت بڑے عالم تھے ۔ ان کے متعلق علماء لکھتے ہیں ۔

کان ثقة صدوقا انتهت اليه رياسة الحنفيه في زمانه ۔ (فوائد بہیہ)

(آپ بہت صادق اور معتبر عالم تھے اپنے زمانہ میں حنفیت کی ریاست ان پر تمام ہو چکی تھی (ان کے زمانہ میں فقہ حنفی کا عالم ان سے زیادہ اور کوئی نہ تھا ۔)

صاحب موصوف اپنی مشہور و معروف کتاب قدوری میں لکھتے ہیں ۔

لا يجوز الاستيجار على الاذان والامامة وتعليم القرآن والحج ۔ (قدوری کتاب الاجارہ ، ص۱۰۲)

اذان، امامت، تعلیم القرآن اور حج پر اجرت لینا جائز نہیں ۔

صاحب تنویر الابصار لکھتے ہیں ۔

لا يصح الاجارة للاذان والحج والامامة وتعليم القرآن والفقه ۔ (تنویر الابصار باب الاجارہ)

اذان، حج، امامت، تعلیم قرآن اور تعلیم فقہ پر اجرت لینا جائز نہیں ۔

امام ابوجعفر احمد بن محمد طحاویؒ رقمطراز ہیں۔

فقد ثبت بما ذکرنا کراہیۃ الاستیجار علی الاذان فالاستجار علی تعلیم القرآن

مذکورہ بالا احادیث کی بنا پر ثابت ہوگیا کہ اذان اور تعلیم قرآن کی اجرت لینا مکروہ (تحریمی)[1] ہے

(طحاوی کتاب الاجارۃ۔ جلد ۲۔ صفحہ ۲)

آگے چل کر لکھتے ہیں۔

فالاستئجار علی ذلک استئجار علی الفرض ومن استؤجر علی عمل لہ فیما افترض اللہ علیہ فذلک علیہ حرام لانہ یعملہ لنفسہ لیؤدی بہ فرضاً علیہ۔ (ایضاً)

تعلیم قرآن، اذان، امامت پر اجرت لینا فرض پر اجرت لینا ہے اور جو شخص اللہ پر عائد کئے ہوئے فرائض پر اجرت لے تو یہ اجرت حرام ہے کیونکہ یہ تو وہ اپنی ذات کے لئے کر رہا ہے اور اللہ کے فرائض ادا کر رہا ہے پھر اجرت کس بات کی؟

صاحب بدائع الصنائع لکھتے ہیں۔

الاستیجار علی الصوم والصلوٰۃ والحج انہ لا یصح لانھا من فروض الاعیان ولا یصح الاستیجار علی تعلیم العلم لانہ فرض عین ولا علی تعلیم القرآن عندنا۔

روزہ، نماز، حج، تعلیم علم دین اور تعلیم قرآن پر اجرت لینا ہم حنفیوں کے نزدیک صحیح نہیں کیونکہ یہ فرض عین ہیں اور فرض عین پر اجرت لینی جائز نہیں۔

اس کے بعد علامہ موصوف نے بطور دلیل حضرت عبادہ بن الصامتؓ والی حدیث بیان کی ہے اور پھر فیصلہ کیا ہے کہ

ولا علی الاذان والاقامۃ والامامۃ لانھا واجبۃ

علی ہذا القیاس اذان، اقامت اور امامت پر اجرت لینا بھی جائز نہیں۔

پھر ابوالعاصؓ کی روایت نقل کرکے تصریح کی ہے کہ یہ فرائض اللہ کی عطا کی ہوئی نعمتوں کی بنا پر ہیں، اور پھر دوبارہ ان کی بدولت امید ثواب بھی ہے اس لئے لوگوں سے اجرت لینا قطعاً ناجائز ہے۔

[1] یہ نہ سمجھئے کہ تحریمی کا لفظ میرا اضافہ ہے۔ انہی علامہ طحاوی نے دوسری جگہ اسی اجرت کو حرام لکھا ہے۔ اس لئے یہاں مکروہ سے مراد مکروہ تحریمی ہے۔

بحث کے آخر میں علامہ موصوف نے دو دلیلیں پیش کی ہیں پہلی یہ کہ اذان، اقامت، اور تعلیم قرآن پر اجرت لینا لوگوں کو دین سے متنفر کرتا ہے۔ اور اجرت کا بوجھ عوام الناس پر ڈالنا انہیں حصولِ دین سے بیزار کرتا ہے چنانچہ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن میں اشارہ کیا ہے کہ اے نبی کیا آپ ان لوگوں سے کچھ اجرت مانگتے ہیں جس کے بوجھ سے یہ دبے جا رہے ہیں۔" ولان الاستیجار علی الاذان والاقامۃ وتعلیم القرآن والعلم سبب لتنفیر الناس عن الصلوٰۃ بالجماعۃ وعن تعلیم القرآن والعلم سبب لتنفیر الناس علی الصلوٰۃ بالجماعۃ وعن تعلیم القرآن والعلم لان ثقل الاجر یمنعہم عن ذلک والی ھذا اشار الرب جل شانہ فی قولہ عز وجل ام تسئلہم اجراً فہم من مغرم مثقلون۔" دوسری دلیل یہ دی ہے کہ حضور کی تبلیغ دو طرح کی تھی ایک بلاواسطہ اور دوسری بالواسطہ، بلاواسطہ تو وہی تبلیغ تھی جو آپ نے خود کی اور بالواسطہ وہ تبلیغ ہے جو آپ کے حکم سے قیامت تک اُمت محمدیہ کے مبلغ کرتے رہیں گے پس جس طرح آپ کو بلا اجرت تبلیغ کرنا واجب تھا اسی طرح آپ کے مبلغین کو بھی تبلیغ پر کچھ لینا ممنوع ہے۔ کیونکہ امت کی تبلیغ بھی بالواسطہ حضور ہی کی تبلیغ ہے۔

> فاذا لم یجز لہ اخذ الاجر علی ما یبلغ بنفسہ لما قلنا فکذا لمن یبلغ بامرہ لان ذلک تبلیغ منہ معنا۔ (بدائع الصنائع، جلد ۴، کتاب الاجارہ مطبوعہ مصر صفحہ ۱۹۱)

شمس الائمہ سرخسیؒ لکھتے ہیں۔

> والدلیل علی انہ لا یجوز الاستیجار علی تعلیم القرآن حدیث عبد الرحمٰن بن شبل الانصاری ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال اقرءوا القرآن ولا تاکلوا بہ وقال المدرس العلم ایاک والخبز الرقاق والشرط علی کتاب اللہ تعالیٰ۔

تعلیم قرآن پر اجرت لینے کی ممانعت کی دلیل عبد الرحمٰن بن شبل انصاری کی وہ روایت ہے جس میں آپ نے فرمایا کہ قرآن پڑھو مگر اس کی اجرت نہ کھاؤ اور دوسرے یہ روایت کہ آپ نے ایک مدرس علم دین کو کہا تم اپنے آپ کو پتلی پتلی چپاتیوں اور کتاب اللہ کی اجرت سے بچاؤ۔

اس جگہ علامہ سرخسیؒ نے عبادہ بن الصامتؓ کی روایت نقل کر کے لکھا ہے کہ جو شخص دوسروں کو قرآن پڑھاتا ہے وہ اس امر میں رسولِ خدا کا نائب ہے۔ فہو خلیفۃ رسول اللہ کیونکہ حضورؐ معلّم قرآن[1] مبعوث ہوئے تھے پس جب وہ خود تعلیم بے اجرت دیتے تھے تو" فکذا لک من یخلفہ" پس آپ کے خلیفہ کا بھی یہی حکم ہے ——— ذرا آگے چل کر

---

[1] یعلمہم الکتاب (قرآن)

علامہ سرخسیؒ فرماتے ہیں۔

> ولو استاجر قوما یصومون فی رمضان او غیرہ لم یجز لان المصلی عامل لنفسہ فلا یستوجب الاجر من غیرہ وکذلک ان استاجر من یؤذن لہم فالمؤذن خلیفۃ رسول اللّٰہ صلعم فی الدعاء الی اللّٰہ تعالٰی الخ

ماہ رمضان کے لئے یا کسی اور وقت کے لئے اگر امام اجرت پر رکھا جائے۔ تو نا جائز ہے کیونکہ جب ہر نمازی اپنی ذات کے لئے نماز پڑھتا ہے تو پھر وہ دوسروں سے اجرت لینے کا مستحق کیونکر ہو سکتا ہے۔ اسی طرح اجرت پر مؤذن رکھنا بھی جائز نہیں کیونکہ مؤذن بھی دعوت الی اللہ میں رسولؐ خدا کا خلیفہ ہے۔ جب نمازیوں کی کثرت سے مؤذن کو زیادہ ثواب ملے گا تو پھر اس کا دوسروں سے اجرت لینا کیسے صحیح ہو سکتا ہے۔

اس کے بعد علامہ موصوف نے عثمان بن العاصؓ کی روایت نقل کی ہے اور فاروق اعظمؓ کا وہ قول لکھا ہے جو ایک مؤذن کو آپ نے فرمایا تھا کہ میں تم سے خدا کے لئے دشمنی رکھتا ہوں کیونکہ تو اذان پر اجرت لیتا ہے۔

(المبسوط۔ جلد ۱۶۔ صفحہ ۳۷)

جواز کی سند کتاب و سنت، تعامل صحابہؓ، ائمہ اربعہؒ اور دیگر ائمہ مجتہدین اور علمائے متقدمین کے ان فیصلوں کے بعد سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس قدر تصریحات کے باوجود اجرت لینے کی جو روش پیدا ہو گئی تو اس کے لئے سند کونسی ہے؟ اس سوال کا جواب بھی فقہ کی کتابوں میں ملتا ہے۔

فقہائے متاخرین لکھتے ہیں کہ سب سے پہلے مشائخ بلخ نے اس کے جواز کا فتویٰ دیا۔ مگر انھوں نے بھی یہ نہیں کہا کہ یہ اجرت قطعی حلال ہے بلکہ وہ صاف اقرار کرتے ہیں کہ اصل میں تو یہ چیز حرام ہے مگر صرف زمانہ کی ضرورت کو مدنظر رکھ کر ہم یہ فتویٰ دے رہے ہیں۔ صاحب ہدایہ لکھتے ہیں۔

> والاستیجار علی الاذان والحج وکذا الامامۃ وتعلیم القرآن والفقہ۔ والاصل ان کل طاعۃ یختص بہا المسلم لا یجوز الاستیجار علیہ عندنا وعند الشافعی یصح فی کل ما لا یتعین علی الاجیر لانہ استیجار علی عمل غیر متعین علیہ فیجوز ولنا قولہ علیہ السلام اقرؤا القرآن ولا تاکلوا بہ وفی آخر ما عہد رسول اللّٰہ الی عثمان بن ابی العاص ان اتخذت مؤذنا فلا یاخذ علی الاذان اجرا ولان القربۃ متی حصلت وقعت عن العامل ولہذا تعتبر اہلیتہ فلا یجوز لہ

بخذ الاجر من غیرہ کما فی الصوم والصلوٰۃ ولان التعلیم مما لا یقدر علیہ المعلم الا بمعنی من قبل المتعلم فیکون ملتزماً ما لا یقدر علی تسلیمہ فلا یصح وبعض مشائخنا استحسنوا الاستیجار علی تعلیم القرآن الیوم لانہ ظہر التوانی فی الامور الدینیۃ ففی الامتناع یضیع حفظ القرآن (ہدایہ جلد ۳ - ص۳۰۳)

اذان، حج، امامت، تعلیم فقہ کی اجرت لینا جائز نہیں اور اصول یہ ہے کہ تمام وہ عبادات جو مسلمانوں سے مخصوص ہیں ان کی اجرت ہمارے نزدیک ناجائز ہے۔ ہاں امام شافعیؒ کے نزدیک ان عبادات پر جو فرضِ عین ہیں اجرت لینا ناجائز ہے اور جو فرضِ عین نہیں ان کی اجرت جائز ہے مگر ہمارے نزدیک ہر قسم کی عبادت کا اجر خواہ وہ فرضِ عین ہو یا نہ ہو حرام ہے اس مسئلے کے متعلق ہمارے پاس چار دلائل ہیں۔

(۱) حضورؐ کا فرمان ہے کہ قرآن پڑھو اور اس کا معاوضہ نہ کھاؤ۔

(۲) حضورؐ نے ابن ابی العاصؓ سے کہا کہ ایسا مؤذن مقرر کرنا جو اذان کی اجرت نہ لے۔

(۳) جو شخص عبادت کرتا ہے اس کا ثواب اسی کو ملتا ہے اس لئے اس کی اہلیت ضروری ہے پس اُسے دوسرے سے اجرت لینا ناجائز ہے۔

(۴) تعلیم ویک ایسا کام ہے جو طالبِ علم کی لیاقت اور محنت کے بغیر معلم سرانجام نہیں دے سکتا اس لئے اسے ایسے کام کا ملتزم بنانا جس پر وہ اکیلا قادر نہیں، غیر صحیح ہے لیکن بعض ہمارے مشائخ نے صرف تعلیم قرآن کی اجرت کو آجکل کے زمانہ میں جائز کہا ہے کیونکہ امورِ دینیہ میں سستی پڑ گئی اور اجرت کو ممنوع قرار دینے میں قرآن کریم کا حفظ جاتا ہو جائے گا۔

غرضیکہ عہدِ رسالت سے لے کر چار صدیوں تک ہر قسم کا معاوضہ ناجائز رہا، پھر پانچویں صدی سے آٹھویں صدی تک تمام عبادات کی اجرتوں کو ناجائز قرار دے کر صرف تعلیم قرآن کی اجرت کو ضرورتِ زمانہ کی وجہ سے جائز کیا گیا۔ قاضی خان نے تصریح کی ہے کہ

بخلاف الامامۃ والاذان لانھا لا یتعطل عنھما الرزق

(فتاویٰ قاضی خان باب الاجرت الفاسدہ)

امامت اور اذان کی اجرت قطعاً ناجائز ہے کیونکہ تعلیم قرآن پر وقت صرف ہوتا ہے اور روزگار میں خلل پڑتا ہے لیکن امامت اور اذان سے روزگار میں کوئی خلل نہیں آتا۔

یہ آٹھویں صدی تک کی بات تھی نویں صدی کے بعد عملاً تمام عبادات کی اجرت کو جائز قرار دیدیا گیا۔ صاحب تنویرالابصار کی یہ عبارت آپ کی نظروں سے گزر چکی ہے کہ "لا یصح الاجارۃ للاذان والحج والامامۃ وتعلیم القرآن والفقہ۔ یعنی اذان، حج، امامت، تعلیم قرآن اور تعلیم فقہ پر اجرت جائز نہیں۔ اب اس کے شارح، صاحب درالمختار کی شرح دیکھئے۔

یفتی الیوم بصحتہا لتعلیم القرآن والفقہ والامامۃ والاذان

آجکل فتویٰ یہ ہے کہ تعلیم قرآن، تعلیم فقہ، امامت اور اذان کی اجرت صحیح ہے۔

شارح و ماتن کا یہ تضاد کیوں؟ شارح نے اس کے متعلق کچھ نہیں کہا۔

ختم قرآن کی کم از کم اجرت

اس سے آگے بڑھے تو یہاں تک بھی کہہ دیا گیا کہ۔

لا یجوز الاستیجار علی الختم باقل من خمسۃ واربعین درہما

(شامی، مطبوعہ مصر، جلد ۵، صفحہ ۳۔ سطر ۱۸)

ختم قرآن کی اجرت پینتالیس درہم سے کم یعنی جائز نہیں

معاوضہ نہ دینے والوں کی سزا بھی مقرر کردی گئی۔

حلوہ ضرور لیا جائے

ویجب بہ ویجبر علی الحلوا الموسومۃ جمع ما یہدی للمعلم علی رؤس بعض سور القرآن سمیت بہا لان العادۃ اہداء الحلاوی۔ (درالمختار بحوالہ شامی۔ جلد ۵، صفحہ ۳۶)

اگر کوئی شخص معاوضۂ عبادات نہ دے تو اسے قید کیا جائے اور اس رسمی حلوے کے دینے پر لوگوں کو مجبور کیا جائے جو قرآن کی بعض سورتوں کے شروع میں دینے کا رواج اور عادت ہے۔

علامہ شامی کی تصریح

ہم آخر میں علامہ ابن عابدین شامی کی یہ تصریحات درج کرکے اس طویل مضمون کو ختم کرتے ہیں۔

"اصل یہ ہے کہ تمام عبادات کا معاوضہ حرام ہے مگر ہدایہ، کنز، مواہب الرحمٰن اور دوسری کتابوں کے متنوں میں اجرتِ قرآن کو بعد میں مستثنیٰ کیا گیا پھر وقایہ اور صلاح میں فقہ کی اجرت کو بھی بڑھا دیا گیا پھر مجمع، ملتقی اور درالبحار میں امامت کی اجرت کو زیادہ کیا گیا اور پھر بعض نے اذان، امامت اور وعظ کی اجرت کو بھی اس فہرست میں داخل کر دیا لیکن ہدایہ کی طرح اکثر کتابوں میں تعلیم قرآن کی اجرت پر اکتفا کیا گیا۔ یہ سب متاخرین کے فتوے ہیں۔ اور وہ عجمی علماء ہیں اور ان بلخیوں میں سے بھی سب نے یہ فتویٰ نہیں دیا، بلکہ بعض ان کے [illegible] بھی ہیں جن لوگوں نے معاوضہ عبادات کو جائز کیا انھوں نے امام اعظمؒ اور صاحبینؒ کے برخلاف فتوے دیئے ہیں۔

تاہم اس بات پر تمام علماء متفق ہیں کہ اصل مذہب عدم جواز کا ہے اور بعد میں بعض عبادات کو مستثنیٰ کیا گیا ہے۔ یہ اس بات کی دلیل قاطع اور برہان ساطع ہے کہ بایں ہمہ تمام عبادات پر اجرت لینا اصلاً ناجائز ہے۔"

(ردالمحتار شامی۔ مطبوعہ مصر۔ جلد ۵ صفحہ ۳۶)

طلوع اسلام

مخدوم نصیر شاہ صاحب نے جو بحث اٹھائی ہے وہ بڑی غور طلب ہے۔ اس لئے کہ یہ سوال بڑا اہم ہے کہ دین کی تبلیغ اور تعلیم کا صحیح نظام کیا ہے، اور جو لوگ ان امور کی سرانجام دہی کے لئے مامور کئے جائیں ان کے معاش کی صورت کیا ہونی چاہیئے ——— اس وقت بھی جب اسلامی نظام مملکت موجود نہ ہو اور اس نظام کے تابع بھی ——— چونکہ محترم مقالہ نگار نے اس مسئلہ پر زیادہ روشنی فقہ حنفی کی رو سے ڈالی ہے، اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ پہلے اس مسئلہ کو حنفی فقہ کی رو سے بالکل صاف اور واضح کر لیا جائے۔ اس سلسلہ میں اگر علمائے احناف میں سے کوئی صاحب وضاحت فرمائیں تو ہم ان کی تصریحات کو شکریہ کے ساتھ طلوع اسلام میں شائع کریں گے۔ بشرطیکہ وہ ذاتیات میں الجھے بغیر خالص علمی نقطۂ نگاہ سے اس پر بحث کریں۔ بعد میں ہم یہ عرض کریں گے کہ ہماری بصیرت کے مطابق قرآن کریم سے اس باب میں کیا راہ نمائی ملتی ہے۔

خط و کتابت کے سلسلے میں ضروری اعلان

ادارہ اور میزان کو خط لکھتے ہوئے بعض احباب ایک ہی خط میں ہر دو دفاتر سے متعلقہ امور لکھ بھیجتے ہیں۔ اور اس بنا پر ان کی تعمیل میں جو خلل پیش آتی ہے وہ ظاہر ہے۔ براہ نوازش اسے پیش نظر رکھئے کہ ادارہ اور میزان کے دفاتر ایک دوسرے سے الگ ہیں اس لئے

۱۔ ہر قسم کی کتب کے لئے صرف میزان کو لکھئے۔ اس سلسلے میں خط و کتابت کے علاوہ، رقم کی ترسیل بھی براہ راست "میزان پبلیکیشنز" کے نام ہونی چاہیئے۔

۲۔ ادارہ کو وہی کچھ لکھئے جس کا تعلق ماہنامہ "طلوع اسلام" سے ہو یا بزموں سے۔

۳۔ بزموں کی رپورٹیں آپ مجلس عاملہ کے بجائے ادارہ طلوع اسلام کو بھیجی جائیں اور اس سے متعلقہ ترسیل زر وغیرہ بھی براہ راست ادارہ کے پتہ پر ہو۔

(ناظم ادارہ)

رابطہ باہمی

بزمہائے طلوعِ اسلام کی ماہانہ رپورٹیں

پشاور:- مفہوم القرآن کا ہفتہ واری درس بذریعہ ٹیپ ریکارڈر جاری ہے۔ قرآنی فکر کی نشر و اشاعت مقامی اخبارات کی وساطت سے جاری ہے اور اُن میں ان غلط فہمیوں اور شکوک و شبہات کا ازالہ کیا جاتا ہے جو مخالفین، برائے مخالفت پیدا کرتے ہیں۔ مفہوم القرآن کے پاروں کی اشاعت و خریداری کا سلسلہ بھی کامیابی سے جاری ہے۔

چنیوٹ:- ۴ جنوری کے اجلاس میں قرآنی پیغام کی اشاعت و تبلیغ کے لئے اہم فیصلے کئے گئے۔ مقامی پبلک لائبریری اور بعض سکولوں میں طلوعِ اسلام کے پرچے پہنچانے کا انتظام کیا گیا۔ اہلِ علم حضرات کے لئے طلوعِ اسلام کے مطالعہ کی سہولتیں مہیا کرنے پر بھی غور کیا گیا۔ تین نئے احباب نے بزم کی رکنیت قبول کی۔

بوریوالہ:- بزم کے اجلاس اور قرآنی فکر کی اشاعت کا سلسلہ باقاعدگی اور پوری سرگرمی سے قائم ہے۔ بزم کی لائبریری بلند پایہ قرآنی لٹریچر سے اہلِ علم حضرات کو مستفید کر رہی ہے۔ طلوعِ اسلام کے تیئیس نئے خریدار پیدا کئے جا چکے ہیں۔ لغات القرآن کے پانچ سیٹ خرید لے جا چکے ہیں۔ اور مفہوم القرآن کے مستقل خریداروں کی تعداد تیرہ تک پہنچ گئی ہے۔ مضافات کی بستیوں میں بھی سلسلۂ اشاعت جاری ہے۔

کوئٹہ:- مفہوم القرآن اور لغات القرآن کے درسوں کا سلسلہ جاری ہے۔ محترم حسن عباس رضوی بزم کے ہر اجلاس میں کسی نہ کسی اہم موضوع پر قرآنی فکر کی روشنی میں مقالہ پیش کرتے ہیں جو بڑا

مفید ثابت ہوتا ہے۔ ماہ رواں کی چودہ تاریخ کو بزم اپنی سال گرہ کی تقریب منا رہی ہے۔ یہ ایک یادگار اجتماع ہوگا۔

چک چھمرہ:- بزم باقاعدگی سے اپنے اجتماع منعقد کر رہی ہے۔ ۸ر جنوری کے اجلاس میں قرآنی مقاصد کی نشر و اشاعت کی توسیع پر غور کیا گیا۔ یہ کوششیں کامیابی سے جاری ہیں۔ اہلِ علم طبقہ بڑے ذوق و شوق سے قرآن کے زندہ جاوید پیغام کا مطالعہ کر رہا ہے اور ہم آہنگی کی فضا پیدا ہو رہی ہے۔ مفہوم القرآن کی اشاعت میں بھی اضافہ کی بڑی توقع ہے

پنج کسی:- مفہوم القرآن کا درس باقاعدگی سے جاری ہے اور بزم کے اجلاس بھی۔ اس ماہ اراکین بزم نے کیمبر والا کے مذہبی اداروں میں پمفلٹوں کی تقسیم کی۔

مردان:- بزم کی طرف سے طلوعِ اسلام کے علاوہ مفہوم القرآن کے پاروں اور دیگر لٹریچر کی تقسیم کا سلسلہ جاری ہے۔ مفہوم القرآن کے پندرہ مستقل خریدار ہیں اور اس کے پاروں کے مطالعہ سے مزید احباب نے اس کی خریداری قبول کر لی ہے۔ ٹیپ ریکارڈ خریدنے کا بھی انتظام کیا جا رہا ہے اور احباب اس میں بڑی فیاضی سے حصہ لے رہے ہیں۔ حالیہ اجتماع میں "تقلید" اور "سوال و جواب" سے متعلق پرویز صاحب کے ٹیپ سنائے گئے جو بیحد پسند کئے گئے۔

رحیم یار خاں:- رحیم یار خاں کی نئی بزم کا پہلا اجلاس شیخ عبدالعزیز صاحب ایڈووکیٹ کے دولت کدہ پر ہوا۔ احباب نے اتفاقِ رائے سے محترم عظیم اشرف صاحب وکیل کو نمائندہ بزم منتخب کیا۔ اس اجلاس میں ملک غلام کبریا صاحب (نمائندہ بزم کوئٹہ) اور عظیم اشرف صاحب نے احباب سے خطاب کیا۔ سید ثناء اللہ صاحب نے اپنا مقالہ پڑھا۔

راولپنڈی:- بزم کے ہفتہ وار اجلاس بروز جمعہ (چار بجے بعد دوپہر) باقاعدگی سے منعقد ہوتے ہیں۔ حاضری آہستہ آہستہ بڑھتی جا رہی ہے۔ مفکرِ قرآن کا درس بذریعہ ٹیپ اس اجتماع میں سنایا جاتا ہے اس کے ذریعے بہت سے اہم قرآنی حقائق پر سے نقاب اٹھتے ہیں اور سامعین کے قلب و نگاہ کو ایک نئی روشنی حاصل ہوتی ہے۔

واہ کینٹ:- بزم نشر و اشاعت کے میدان میں سرگرم عمل ہے۔ ۲ر دسمبر کو احباب نے اس مقصد کے لئے ملحقہ دیہات کا دورہ کیا۔ اس دورے سے خوشگوار اثرات مرتب ہوئے اور بعض صاحب علم احباب نے بزم کی رکنیت قبول کی۔ ۱۶ر دسمبر کا اجلاس بھی کامیاب تھا۔ اس اجلاس میں طلوعِ اسلام کی اشاعت اور نئی رکنیت

آگے بڑھانے کے سلسلے میں ضروری فیصلے کئے گئے۔ مفہوم القرآن کی اشاعت تیزی سے ہو رہی ہے۔

لندن:

بزم طلوعِ اسلام کا اجلاس محترم چغتائی صاحب کے دولت کدہ (AD-HOWARD WALK) پر ہوا۔ اراکین بزم کے علاوہ طلباء اور طاہرہ بہنوں نے بھی شرکت کی۔ ٹیپ ریکارڈ سے مفکرِ قرآن پرویز صاحب کی اہم تقریر ــــ "اسلام ہی کیوں سچا دین ہے؟" ــــ سنائی گئی۔ علاوہ ازیں خانگی زندگی پر بھی پرویز صاحب کی تقریر کا ریکارڈ سنایا گیا۔ یہ سب کچھ فکر انگیز بھی تھا اور اثر آفریں بھی۔ اس اجلاس میں (EASTEND) (لندن) کی مسجد کے امام خواجہ قمر الدین بھی تشریف لائے تھے۔ مختلف حضرات اور اداروں کو جو پمفلٹس بذریعہ ڈاک بھیجے جاتے ہیں انھوں نے بڑا عمدہ اثر پیدا کیا ہے۔ اور ان کے مطالعہ کے بعد بہت سے حضرات نے نہ صرف بزم سے رابطہ پیدا کیا ہے بلکہ اس کی رکنیت کے بھی خواہشمند ہیں۔ باہر کے بہت سے احباب نے ہمیں لکھا ہے کہ ہر نیا پمفلٹ جو آئے انہیں ضرور بھیجا جائے۔

بزم لندن اگلے ماہ اپنی سالگرہ کی تقریب منا رہی ہے۔

سانحۂ ارتحال

بزم سرگودھا کے مخلص رفیق سردار نصیر احمد کی جگر پاش موت کی خبر (ابھی ابھی) ادارہ میں موصول ہوئی ہے۔ سردار نصیر احمد مرحوم قرآنی تحریک کے قابل قدر رفقاء میں سے تھے۔ اس لئے یہ المناک سانحہ ادارہ طلوعِ اسلام کے لئے انتہائی رنج و غم اور اندوہ ملال کا باعث ہے۔ اس حادثہ الیم میں ہم وابستگانِ مرحوم اور بزم سرگودھا سے دلی تعزیت کا اظہار کرتے ہیں۔ خدا مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ (ادارہ)

راولپنڈی کے احباب

نوٹ فرمالیں کہ ہر جمعہ بوقت چار بجے شام بمقام الکوثر بلڈنگ بالمقابل گورنمنٹ گرلز کالج۔ مری روڈ پر محترم پرویز صاحب کا درس قرآن مجید بذریعہ ٹیپ سنایا جاتا ہے

"بزم طلوعِ اسلام راولپنڈی"

خریدارانِ طلوعِ اسلام اور محکمۂ ڈاک کے کارفرماؤں کی توجہ کے لئے

طلوعِ اسلام کے خریداروں کی طرف سے مسلسل ابھی شکایات کی بھرمار چلی آ رہی ہے کہ انہیں پرچہ باقاعدگی سے نہیں مل رہا۔ ہر ماہ پرچوں کی ایک تعداد خریداروں تک نہیں پہنچتی۔ ادارہ نے ہر ممکن ساعی سے کام لیا کہ یہ افسوسناک صورتِ حال ختم ہو۔ ہر ماہ پوری احتیاط سے ایک ایک خریداری نمبر، ایک ایک کور اور ایک ایک ایڈریس چیک کیا جاتا رہا اور پوری کوشش کی گئی کہ ایسی شکایات کے ازالہ سے خریداروں کو بے جا کوفت، اور ادارہ کو ناحق بدنامی اور پریشانی سے محفوظ رکھا جائے۔

لیکن شکایات کا یہ سلسلہ ختم ہونے میں نہیں آیا۔

شکایت موصول ہونے پر جب ہم نے پرچوں کو دوبارہ ارسال کیا تو پھر بھی ان میں سے کئی پرچے منزلِ مقصود تک پہنچ سکے ہی نہیں ——— بلکہ اس کے علاوہ ایسی مثالیں موجود ہیں کہ

۱۔ رجسٹری شدہ پرچے بھی، جن کی رسید تک ہمارے ہاں موجود تھی، متعلقہ خریدار تک نہیں پہنچے۔

۲۔ ایسے وی پی شدہ پرچے واپس آ گئے جن کے پرانے خریداروں نے ہمیں پیشگی لکھا تھا کہ ان کا وصول کرنا اُن کا "مقدس فرض" ہوگا۔ اور وی پی اس ریمارک کے ساتھ واپس آ گئی کہ وہ لینے سے انکاری ہے اور ادھر خریدار کی طرف سے شکایت موصول ہو گئی کہ آپ نے ابھی تک وی پی نہیں بھیجی۔

ادارہ نے محکمۂ ڈاک کو اس صورتِ حال پر متوجہ کیا

لیکن تلافیٔ مافات اور اصلاحِ حال کی کوئی صورت ابھی تک ممکن نہیں ہوئی۔

یہ ہے وہ صورتِ حال جسے ہم تنگ آ کر طلوعِ اسلام کے کالموں میں زیرِ اشاعت لانے پر مجبور ہوئے ہیں۔ اس سے بار بار ذہن اس طرف منتقل ہوتا ہے کہ کیا یہ سب کچھ طلوعِ اسلام کے خلاف کسی ناروا سازش کا نتیجہ تو نہیں؟

ان مجبوریوں میں ہم اپنے خریداروں سے ایک ہی گزارش کریں گے اور وہ یہ کہ ان حالات میں اگر انہیں پرچہ موصول نہ ہو تو وہ ادارہ سے ناراض ہونے کی بجائے صرف ایک اطلاعی کارڈ بھیج دیا کریں۔ ادارہ حتی الامکان کوشش کریگا کہ نقصان برداشت کرتے ہوئے بھی پرچہ بار دگر بھیجدے۔

ہم محکمۂ ڈاک کو بھی ایک بار پھر اس صورتِ حال پر متوجہ کر رہے ہیں۔ خدا کرے کہ اس محکمہ کے کارفرما متعلقہ شکایات کے ازالہ سے ہمیں شکرگزار کر سکیں۔

(ناظم ادارہ طلوعِ اسلام لاہور)

اسلام پر مختلف ثقافتوں کے اثرات

(علامہ احمد امین مصری مرحوم)

(۳)

سابقہ قسط میں ضحی الاسلام سے وہ حصہ درج کیا گیا تھا جس میں فاضل مصنف نے بتایا ہے کہ اسلام پر یونانی تہذیب کے کیا اثرات ہوئے۔ اس حصہ کا بقایا درج ذیل ہے۔

یونانی اور رومی ثقافت کی ایک اور نوع بھی تھی جو پہلی نوع سے خفیف تھی۔ اس نوع سے ہماری مراد وہ ثقافت ہے جو اجتماعی زندگی میں دو جنسوں کے امتزاج سے پیدا ہوئی تھی یعنی جنس عربی اور جنس یونانی یا رومی، کیونکہ رومی لوگ عربوں کے کانوں اور آنکھوں کے سامنے رہتے تھے۔ ان کی اپنی عادات و رسوم اور تقلیدات تھیں، نظام حکومت کے سلسلہ میں ان کی اپنی افکار و آراء تھیں۔ موسیقی اور صورتگری کے سلسلے میں ان کے اپنے فنون تھے۔ عرب کے لوگ ان کی بہت سی باتوں کو اپنا لیتے تھے کسی منظم درس و تدریس کے ذریعہ نہیں اور نہ ہی کسی علمی بحث کے ماتحت بلکہ مشاہدہ اور نظر یا گفتگو اور مشافہہ کے ماتحت۔ عراق اگرچہ یونان کی علمی ثقافت کا بڑا اہم مرکز تھا لیکن شام ـــــ بظاہر ایسا ہی معلوم ہوتا ہے ـــــ اس قسم کی اجتماعی ثقافت کا زیادہ اہم مرکز تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ شام اسلامی فتوحات کے وقت رومیوں کا محکوم تھا۔ رومیوں کا شام پر تسلط عراق کی بہ نسبت زیادہ مستحکم تھا۔ کیونکہ عراق ایک دوسری طاقت و حکومت ـــــ ایران ـــــ کے قریب واقع تھا۔ اور اکثر اوقات وہ ایرانیوں کے غلبہ و تسلط میں بھی آجاتا تھا۔ اس کے برعکس شام میں یہ بات نہیں تھی۔ علاوہ ازیں شام میں عرب کے بہت سے لوگ آباد تھے اور رومی بھی بکثرت آباد تھے اور ان دونوں میں کامل اختلاط تھا ـــــ روم کے لوگ جب شام سے نکلے ہیں تو اپنے پیچھے بہت سی عادات، تقلیدات، فنون اور نظم اجتماعی

کے اصول بھی چھوڑ گئے جنہیں عربوں نے اپنا لیا۔

اس کی مثال میں موسیقی کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ اغانی کا بیان ہے کہ مسلمانوں نے رومیوں سے ان کے بعض راگ لے لئے تھے۔ رومیوں سے راگوں کے لینے کی جگہ ظاہر ہے کہ شام ہی تھا چنانچہ خود صاحب اغانی ابن محرز کے بارہ میں لکھتے ہیں کہ "وہ ایران گئے اور وہاں سے انھوں نے ایرانیوں کے راگ لئے۔ اس کے بعد وہ شام گئے اور وہاں سے انھوں نے رومیوں کے راگ لئے۔ اس کے بعد ان تمام راگوں میں سے ابن محرز نے ان راگوں کا انتخاب کیا جس میں انھوں نے خود اپنے گانے گائے" اسی طرح صاحب اغانی نے ابن مسجح کے بارہ میں لکھا ہے کہ "وہ شام کی طرف گئے اور رومیوں کے بہت سے راگ انھوں نے وہاں سے لئے"[1]

غلاموں پر گفتگو کرتے ہوئے ہم دیکھ چکے ہیں کہ ان میں زیادہ تر غلام رومی تھے۔ یہ غلام لڑکیوں اور باندیوں کی شکل میں۔ خلفاء، اغنیاء، شعراء اور علماء سب ہی کے محلات میں موجود تھے۔ چنانچہ مامون کی کئی باندیاں رومی تھیں جو اپنا رومی لباس پہنتی تھیں اور زنار وغیرہ باندھتی تھیں۔ ابو تمام شاعر کے پاس بھی ایک رومی غلام تھا[2]۔ وغیر ذالک۔

ابن ابی اصیبعہ بیان کرتے ہیں کہ "ہارون رشید کی ایک رومی باندی تھی جس کا نام خرشتی تھا۔ اس کی ایک قریبی عزیزہ اس کی بہن یا بھانجی بھی تھی۔ ہارون رشید کو وہ بہن یا بھانجی نظر نہ آئی تو اس نے خرشتی سے اس کے متعلق پوچھا تو خرشتی نے بتایا کہ اس نے اس کی شادی ایک عزیز سے کر دی ہے۔ ہارون رشید اس پر سخت ناراض ہوا اور خرشتی سے پوچھا کہ تو نے میری اجازت لئے بغیر ایسا کرنے کی جرأت کیسے کی۔ تو نے اسے میرے روپیہ سے خریدا تھا۔ ہارون رشید نے سلام ابرش کو حکم دیا کہ وہ اس کے شوہر کو اس فعل کی سزا دے۔ سلام اس کے متعلق برابر معلومات حاصل کرتا رہا چنانچہ وہ اسے مل گیا تو اس نے اسے خصی کر دیا۔ اس رومی لڑکی کو اس کے شوہر سے حمل رہ گیا تھا جب اس لڑکی کے بچہ پیدا ہوا ـــــــ اس وقت ہارون رشید کا انتقال ہو چکا تھا ـــــــ تو خرشتی نے اس لڑکے کو اپنا منہ بولا بیٹا بنا لیا اور رومی آداب اور رومی لٹریچر کی اسے تعلیم دلوائی۔ بعد میں اس نے یونانی زبان اور یونانی علوم بھی سیکھے اور ان علوم و فنون میں اس نے بلند مرتبہ حاصل کر لیا۔ یہ لڑکا آگے چل کر اسحاق بن الخصی کے نام سے مشہور ہوا، اکثر اہل علم و ادب اس کے سامنے زانوئے ادب تہ کرتے تھے"[3]۔

[1] صفحہ ۱۸۵ جلد ۱ [2] صفحہ ۹۳ جلد ۲ [3] اغانی صفحہ ۱۰۷ جلد ۱۵

اس دور میں رومیوں اور مسلمانوں کے درمیان برابر جنگیں ہوتی رہتی تھیں۔ دونوں طرف کے قیدی ایک دوسرے کے ہاتھوں پڑتے تھے۔ مسلمان قیدی قسطنطنیہ جاتے تھے اور رومی قیدی عراق آتے تھے۔ تاریخ میں ان دونوں قسم کے قیدیوں کی حکایتیں بے شمار ملتی ہیں۔ خصوصاً ہارون رشید کے عہد میں اجتماعی زندگی کے اختلاط و امتزاج کے اسباب میں سے یہ غلام بھی ایک بڑا ذریعہ تھے۔ اس طرح دونوں طرف کے لوگوں نے ایک دوسرے سے کچھ نہ کچھ سیکھا۔ یہ بات تو سمجھ میں بھی نہیں آسکتی کہ یہ اختلاط و امتزاج ہوتا رہے ـــــ کیونکہ اکثر اسلامی شہروں پر پہلے رومی حکومت کرتے رہے۔ اس کے بعد قید ہوکر اور اور غلام بن کر آتے رہے۔ اس کے بعد مسلسل ان کا ٹکراؤ ہوتا رہا۔ کبھی صلح کی صورت میں اور کبھی جنگ کی صورت میں ـــــ اور وہ اپنا اثر کئے بغیر رہ جائے۔ لامحالہ بہت سے ایسے مسلمان پیدا ہوں گے جو رومی زبان بولتے ہوں گے اور بہت سے ایسے رومی پیدا ہو گئے ہوں گے جو عربی زبان بولتے ہوں گے کیونکہ (مثلاً) رومی غلام پہلے اپنے گھروں میں ضرورۃً رومی زبان بولتے ہوں گے پھر ٹوٹی پھوٹی عربی بولنے لگے ہوں گے اور آہستہ آہستہ ایسی عربی بولنے لگے ہوں گے جو صحیح عربی سے قریب تر ہوگی۔ یہی حال ان مسلمان قیدیوں کا ہوگا جو روم جاتے اور وہاں کچھ عرصہ تک رہتے ہوں گے۔ پھر دونوں طرف کے ترقی پذیر افراد یہ کوشش بھی کرتے ہوں گے کہ آراء و افکار کا باہم تبادلہ کریں اور زبان اور لٹریچر پر گفتگو کریں۔ چنانچہ اغانی نے اس سلسلہ میں ایک عجیب واقعہ بیان کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ "شہنشاہ روم کا ایک ایلچی ہارون رشید کے پاس حاضر ہوا۔ اور اس نے ابوالعتاہیہ کے متعلق دریافت کیا، ابوالعتاہیہ نے اس ایلچی کو اپنے کچھ اشعار بھی سنائے۔ یہ ایلچی عربی زبان اچھی طرح جانتا تھا۔ جب یہ ایلچی شہنشاہ روم کے پاس پہنچا تو اس نے وہاں ابوالعتاہیہ کا ذکر بھی کیا۔ شہنشاہ روم نے اپنے ایک خط کے ساتھ اس ایلچی کو دوبارہ ہارون رشید کے پاس بھیجا اور ہارون رشید سے درخواست کی کہ وہ ابوالعتاہیہ کو اس کے پاس بھیج دیں۔ اور اس سلسلہ میں جس قدر ضمانتیں چاہیں لے لیں۔ جن لوگوں کو چاہیں اس کی ضمانت میں اپنے پاس رہن رکھ لیں۔ اس نے بے انتہا اصرار کیا۔ چنانچہ ہارون رشید نے ابوالعتاہیہ سے اس بارہ میں بات کی مگر ابوالعتاہیہ نے معافی چاہی اور انکار کر دیا۔"

ادب میں یہاں ہمارے سامنے ایک سوال آتا ہے جو ذہن کو اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے۔ اور وہ یہ سوال ہے کہ یونانی علوم اور فلسفہ کی تاثیر کو دیکھتے ہوئے اس کی کیا وجہ ہے کہ عربی ادب پر یونانی ادب

ک طبقات الاطباء صفحہ ۱۸۵ جلد ا ؎ اغانی صفحہ ۱۶۹ جلد ۱

کے بہت ہی کم اثرات مرتب ہوئے۔ آپ ان کتابوں کے نام پڑھتے چلے جایئے جو یونانی سے عربی زبان میں ترجمہ ہوئیں۔ آپ کو علوم ریاضیہ، طبیہ اور فلسفیہ کی ہر شاخ سے متعلق بے شمار کتابوں کے نام مل جائیں گے لیکن آپ کو کوئی نام نہیں ملے گا تو وہاں یونان کی کسی ادبی کتاب کا نام نہیں ملے گا جس کا عربی زبان میں ترجمہ کیا گیا ہو۔ حالانکہ یونانیوں اور رومیوں کے ہاں ادب کی نہایت بلند پایہ کتابیں موجود تھیں۔ اس کے چند اسباب کی طرف ہم پہلے بھی اشارہ کر چکے ہیں[1]۔

ادب میں یونانی اثرات کی کمزوری کی وجہ

یہاں ہم ایک اور سبب کا اضافہ کرنا چاہتے ہیں۔ اور وہ یہ ہے کہ فلسفہ اور دیگر علوم، عالمی حیثیت رکھتے ہیں اور ادب قومی حیثیت رکھتا ہے۔ کیونکہ فلسفہ اور دیگر علوم تو عقل کا نتیجہ ہوتے ہیں اور عقل تمام افراد اور اقوام میں ایک قدر مشترک ہوتی ہے ——— اگرچہ اس میں فرق ضرور ہوتا ہے کہ کن افراد اور اقوام کو عقل کا کتنا حصہ ملا ہے ——— منطق جو ان تمام علوم میں نظم و ضبط پیدا کرتی ہے اسے سارے لوگوں کی عقل ہی قبول کر لیتی ہے۔ ہندسہ اور طب کے قواعد تمام لوگوں ہی پر منطبق ہو جاتے ہیں لیکن جہاں تک ادب کا تعلق ہے تو وہ دراصل جذبات و عاطفات کی زبان ہوتی ہے۔ جذبات و عاطفات کے لئے کوئی منطق نہیں ہوتی جو ان میں نظم و ضبط پیدا کرے۔ علاوہ ازیں ادب درحقیقت اجتماعی زندگی کا عکس ہوتا ہے۔ ہر قوم کی اپنی اپنی اجتماعی زندگی ہوتی ہے جس میں وہ دوسری قوموں سے ممتاز ہوتی ہے شکل و صورت کے لحاظ سے بھی اور مقاصد کے اعتبار سے بھی۔ یہی وجہ ہے کہ عرب کا ذوق ارسطو کی منطق اور جالینوس کی طب کو ہضم کر لیتا ہے مگر ہومیروس کے "الیاذہ" (ILIAD) کو ہضم نہیں کر سکتا۔ آپ آج کے زمانہ میں بھی دیکھ لیجئے جبکہ افراد اور اقوام کا ارتباط اس سے کہیں زیادہ مستحکم ہو چکا ہے جتنا پرانے زمانہ میں تھا لیکن ہم میں سے کسی کا عربی ذوق "الیاذہ" کو قبول نہیں کرتا۔ بجز اس کے کہ کوئی شخص یونان کی اجتماعی زندگی سے اچھی طرح واقف ہو اور اس کی کہنہ اور حقیقت پر عبور حاصل کر چکا ہو اور طویل عرصہ تک مشق کر کے اپنے ذوق کو "الیاذہ" کو قبول کرنے پر تیار کر چکا ہو۔

ایک تیسرا سبب بھی ہے جو ممکن ہے کہ صحیح ہو اور وہ یہ ہے کہ یونانی ادب اصنامی ادب ہے۔ اس میں متعدد دیوی اور دیوتا ہیں۔ اس میں بہادروں کی پرستش وغیرہ بھی ہے جب یونانی علوم کا ترجمہ کیا گیا تو عربی ذوق مسلم

---

[1] فجر الاسلام صفحہ ۱۶۱

ذوق بن چکا تھا جو اس قسم کے اصنامی لٹریچر کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

ان تمام باتوں کے باوجود عربی زبان اور عربی لٹریچر پر یونان نے چند راہوں سے اپنے اثرات ضرور مرتب کئے تھے۔

(۱) کچھ یونانی الفاظ ملتے ہیں جو معرب کر لئے گئے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ یہ الفاظ زیادہ تر یونانی اور رومی کپڑوں کی اقسام سے تعلق رکھتے ہیں جن سے عرب کے لوگ واقف نہیں تھے۔ بعد میں واقف ہو گئے اور انھوں نے ان کپڑوں کو استعمال کیا اور ان کے لئے ان کے اصلی الفاظ ہی کو قبول کر لیا مثلاً "بَرْجَدْ" (PARAGAUDA) یہ ایک دھاری دار موٹا کمبل ہوتا ہے "اَبُوْقَلَمُوْن" یہ ایک رومی کپڑا ہوتا ہے جو نگاہ کو مختلف رنگوں میں نظر آتا ہے۔ یا کچھ ایسی چیزوں کے نام ہیں جنھیں عربوں نے رومیوں کے ساتھ ارتباط ہو جانے کے بعد پہچانا کیونکہ وہ جزیرۂ عرب کی پیداوار نہیں تھے مثلاً زبرجد۔ زمرد۔ یاقوت وغیرہ۔ یا ناپنے تولنے کے رومی اوزان مثلاً قیراط اور اوقیہ وغیرہ۔ یا طبی اور نباتاتی نام جیسے مثلاً بلغم، قولنج، برقوق، لوبیا، ترمس، یا نصرانی کلمات جیسے جاثلیق، بطریق وغیرہ ذالک[1]۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ زیادہ تر یہ الفاظ عربوں میں شام کی راہ سے سرایت کر گئے تھے اور اس کا سبب وہی تھا جو ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔

(۲) کچھ یونانی کہانیاں ہیں جن کا عربی میں ترجمہ کیا گیا ہے۔ ابن الندیم نے رومیوں کی چند کتابوں کا تذکرہ کیا ہے جو قصوں کہانیوں اور تاریخ سے متعلق ہیں اور جن کا عربی میں ترجمہ کیا گیا ہے[2]۔ جاحظ نے کتاب الحیوان میں نقل کیا ہے کہ "یونانیوں میں ایک پُراز معلومات آدمی تھا جس کی طرف عجیب و غریب نوادرات منسوب ہیں۔ اس آدمی کا نام ربیوس تھا حکماء نے اس کے اَسّی سے زیادہ نوادرات بیان کئے ہیں۔ ان میں سے ہر نادرہ اپنی جگہ پر بہترین نادرہ کہلانے کا مستحق ہے۔ ان میں سے ایک نادرہ یہ ہے کہ" وہ روزانہ صبح ہوتے ہی گھر سے فرات کے ساحل کی طرف ——— قضائے حاجت کے لئے یا غسل کرنے کے لئے ——— جایا کرتا تو وہ اپنے دروازہ کے درمیان میں ایک پتھر ڈال دیا کرتا۔ اسی طرح اندر کے کمروں کے دروازوں پر بھی پتھر رکھ دیا کرتا تھا تاکہ دروازہ آسانی سے نہ کھل سکے بلکہ اسے کھولنے اور پتھر کو ہٹانے میں دوسرے آدمی کو ذرا مشقت کرنی پڑے لیکن جب وہ ضروریات سے فارغ ہو کر لوٹتا تو پتھروں کو اپنی جگہ پر نہ پاتا کوئی آدمی ان پتھروں کو ہٹا تا اور دروازے کھلے ہوئے ملتے۔ ایک روز وہ چھپ کر بیٹھ رہا تاکہ دیکھ سکے کہ دروازوں کے ساتھ روزانہ کون شخص یہ سب کچھ کرتا

---

[1] اس سلسلہ میں پادری لامنس کی کتاب الفروق کو ملاحظہ کیجئے [2] الفہرست صفحہ ۳۰۲—۳۰۵

ہے۔ وہ آدمی کا انتظار کر رہا تھا کہ ایک آدمی آتا ہوا نظر آیا۔ اس نے اس پتھر کو اٹھایا۔ پتھر کو اٹھاتے ہی دروازہ کھل گیا۔ ریسیوس نے باہر نکل کر اس آدمی سے پوچھا کہ آپ نے یہ پتھر یہاں سے کیوں اٹھایا اور آپ یہ پتھر کیوں بیچ رہے ہیں؟ اس آدمی نے جواب دیا کہ جناب مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ یہ پتھر آپ کا ہے۔ ریسیوس نے کہا ٹھیک ہے مگر آپ کو یہ تو معلوم تھا کہ یہ پتھر آپ کا نہیں ہے!"

"کسی نے ریسیوس سے کہا۔ آپ بھی عجیب آدمی ہیں۔ لوگوں کو شعر گوئی سکھلاتے ہیں اور خود شعر نہیں کہتے۔ ریسیوس نے کہا کہ میری مثال اس سان کی طرح ہے جو دوسری چیزوں پر دھار رکھ کر کاٹنے کے قابل بنا دیتی ہے اور خود کسی چیز کو نہیں کاٹ سکتی۔"

کسی آدمی نے ریسیوس کو بازار میں کھاتے ہوئے دیکھ لیا۔ اس نے اعتراضاً کہا کہ "آپ بازار میں کھاتے ہیں؟" ریسیوس نے جواب دیا کہ "ریسیوس کو جب بازار میں بھوک لگے گی تو وہ بازار ہی میں کھائے گا۔"

(۳) کچھ حکم بھی ہیں جو عربی میں منتقل ہوئی ہیں۔ چنانچہ فیثاغورث، سقراط، افلاطون، اور ارسطو کی بہت سی حکم ہیں جو عربی میں ترجمہ ہوئی ہیں اور جن سے اس عہد کی ادبی کتابیں بھری ہوئی ہیں، مثلاً البیان والتبیین عیون الاخبار وغیرہ۔ ابن الندیم نے بیان کیا ہے کہ علی بن ربن نصرانی نے ایک کتاب نقل کی ہے جس میں ایرانیوں رومیوں اور عربوں کے طور طریقوں کے مطابق آداب و امثال بیان کی گئی ہیں[1]۔

یہ تو معلوم ہی ہے کہ عربوں کو ادب کی ان دونوں صنفوں "قصص اور امثال" کے ساتھ دیگر اصناف کی بہ نسبت زیادہ لگاؤ تھا۔ چنانچہ انھیں الیاذہ اور دیگر بقیہ روایات، اشعار اور یونانی خطبوں کے ساتھ وہ لگاؤ نہیں تھا۔ اس کی وجہ وہی ہے جو ہم نے اوپر بیان کر دی ہے۔ قصص اور امثال تو عالمی حیثیت کی مالک ہوتی ہیں۔ انھیں مخصوص اجتماعی زندگی سے زیادہ تعلق نہیں ہوتا۔ پھر ان میں وہ یونانی نام بھی نہیں آتے جو عربوں کے کانوں اور زبانوں کے لئے ثقیل اور ناگوار معلوم ہوتے ہوں۔ نہ ان میں ایسے شعری اوزان ہوتے ہیں جو عربی ذوق سے مشابہت نہ رکھتے ہوں۔ اور نہ ہی ان میں کسی ایسی اجتماعی زندگی کا بیان ہوتا ہے جس سے ایک عربی اور مسلمان آدمی مانوس نہیں ہوتا۔

مختصر یہ ہے کہ فلسفہ، علوم ریاضیہ اور طبیہ میں یونانیوں کے اثرات کافی وسیع اور گہرے تھے جبکہ دوسرے گوشوں میں ان کے اثرات بہت تنگ اور نہایت ہلکے تھے۔

---

[1] الحیوان ص۱۴ جلد ۱۔ حکایت میں ہم نے بعض غلطیوں کو درست کر دیا ہے جو اصل میں موجود تھیں [2] الفہرست ص۳۱۶

اس ثقافت کا بہترین نمائندہ حنین بن اسحاق تھا اگر ہم چاہیں کہ ایک ایسا آدمی منتخب کریں جو اس یونانی ثقافت کا نمائندہ بن سکے تو ہم اس مقصد کے لئے حنین ابن اسحاق کا انتخاب کریں گے۔

حنین ابن اسحاق

حنین بن اسحاق کی زندگی حنین بن اسحاق کا لقب ابو زید ہے۔ ان کی پیدائش ۱۹۴ھ میں ہوئی۔ ان کے والد عربی النسل تھے جو قبیلہ عباد سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی سکونت حیرہ میں تھی۔ ان کے والد اسحاق نصرانی تھے اور نسطوری فرقہ سے تھے۔ وہ دوائیں اور جڑی بوٹیاں فروخت کیا کرتے تھے۔ انھوں نے اپنے بیٹے کو طب کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے آمادہ کیا۔ چنانچہ حنین نے یوحنا ابن ماسویہ سے طب کی تعلیم حاصل کرنی شروع کی۔ حنین اپنے استاد سے بہت سوالات کیا کرتے تھے اور اپنے سوالات پر اصرار کیا کرتے تھے جس سے یوحنا تنگی محسوس کرنے لگے تھے۔ چنانچہ یوحنا نے حنین کو نکال دیا اور کہا کہ "حیرہ والوں کو طب سے کیا واسطہ۔ تم تو کہیں راستہ پر بیٹھ کر پیسے فروخت کیا کرنا!" دراصل یوحنا میں جندیسا پور والوں اور جندیسا پور کے مدرسہ کے لئے عصبیت تھی۔ ان کا یہ اعتقاد تھا کہ علم صرف جندیسا پور کے لوگوں ہی کا حصہ ہے۔ ان سے باہر نہیں نکل سکتا۔

یہاں سے حنین ملک روم چلے گئے اور وہاں انھوں نے عمدگی کے ساتھ یونانی زبان سیکھی پھر بصرہ آئے اور خلیل بن احمد کی شاگردی اختیار کی اور ان سے عربی سیکھی۔ لوگ کہتے ہیں کہ خلیل ابن احمد کی کتاب "العین" حنین کے ذریعہ ہی سے بغداد میں پہنچی تھی۔

حنین کو چار زبانوں پر بڑا عبور تھا۔ فارسی، یونانی، عربی اور سریانی۔ حنین کا سب سے بڑا امتیاز یونانی زبان سے عربی اور سریانی زبانوں میں ترجمہ ہے۔ انھوں نے ترجمہ کا کام اسی وقت شروع کر دیا تھا جبکہ انکی عمر صرف سترہ سال تھی لیکن ترجمہ کمزور ہوتا تھا جو خود انھیں بھی پسند نہیں تھا تا آنکہ جب حنین پختگی کو پہنچ گئے تو بعد میں بعض تراجم کو از سر نو لکھا اور بعض تراجم کو درست کیا۔

حنین کی علمی خدمات شروع میں وہ مامون رشید کے ساتھ منسلک ہوئے اور انھیں دارالحکمت کی لائبریری پر نگراں مقرر کیا گیا جس میں وہ یونانی کتابیں ذخیرہ کی جاتی تھیں جو لائی جاتی

کوچک اور قسطنطنیہ سے بغداد میں لائی جاتی تھیں۔ حنین نے ان کتابوں کا اولاً سریانی زبان میں ترجمہ کرنا شروع کیا پھر عربی میں ترجمہ کیا۔ اس کے بعد معتصم، واثق اور متوکل کے عہد میں بھی وہ ترجمہ ہی کا کام کرتے رہے۔

حنین نے صرف ان کتابوں پر ہی اکتفا نہیں کیا جو دارالحکمت میں جمع ہو گئی تھیں بلکہ عراق کے اطراف و جوانب میں سفر کیے۔ شام، اسکندریہ اور بلکہ روم گئے اور ہر جگہ سے نادر کتابیں جمع کیں ۲۶۴ھ میں قریب ستر سال کی عمر پاکر انتقال کیا۔ انھوں نے اس عمر میں وہ گراں بہا علمی خدمات انجام دیں جو کسی دوسرے آدمی سے صدیوں میں بھی نہیں ہو سکتی تھیں۔

حنین خود بھی ترجمہ کرتے تھے اور دوسرے لوگوں کے تراجم کو بھی دیکھتے تھے جو ان کی زیر نگرانی ترجمہ کا کام کرتے تھے۔ متوکل نے ان کے ماتحت بہت سے منشی اور عالم مقرر کر رکھے تھے جنھیں ترجمہ کا اچھا سلیقہ تھا۔ یہ سب ترجمہ کرتے تھے اور حنین ان کے تراجم کو دیکھتے تھے۔ مثلاً اصطفن ابن باسیل۔ موسیٰ ابن خالد ترجمانی اور یحییٰ بن ہارون وغیرہ۔[1]

ان کے تراجم اور تالیفات بکثرت ہیں۔ پھر اکثر انہی ترجمہ کردہ کتابوں کی شرحیں بھی لکھتے تھے۔ طویل کتابوں کا خلاصہ کرتے تھے۔ سابق مترجموں کے تراجم کی تصحیح کرتے تھے۔ مختصر یہ کہ ان کی ذات خود ایک علمی تحریک تھی جو مسلسل کام میں لگی رہتی تھی۔ کم ہی لوگ ہوں گے جو ان کا مقابلہ کر سکتے۔ بلکہ جس علمی تحریک کی انھوں نے بنیاد ڈالدی تھی وہ ان کی وفات کے بعد بھی ان کے دونوں صاحبزادوں اور شاگردوں کے ہاتھوں اپنا کام کرتی رہی۔[2]

حنین نے زیادہ تر طبی کتابوں کا ترجمہ کیا، خصوصاً جالینوس کی کتابوں کا۔ لوگ کہتے ہیں کہ حنین نے جالینوس کی کتابوں میں سے پچانوے کتابوں کا ترجمہ سریانی زبان میں کیا تھا۔ اور ان میں سے انتالیس کتابوں کا ترجمہ عربی زبان میں کیا۔ اپنے شاگردوں کے جن تراجم کی انھوں نے اصلاح کی ہے ان میں سے چھ تو سریانی کے ہیں اور تقریباً ستر عربی کے ہیں۔ علاوہ ازیں ان پچاس کتابوں کے بڑے حصہ کی انھوں نے اصلاح کی جو سریانی زبان میں اطباء متقدمین مثلاً سرجلیس، اسیعنی اور ایوب رہاوی وغیرہ نے کئے تھے۔[3]

اس کے ساتھ ہی ہمیں طب کے علاوہ بھی ان کی بہت سی کتابیں ملتی ہیں منطق، طبیعات، ہیئت، فلسفہ ارسطو

---

[1] اخبار الحکماء ص۱۲۲ [2] ابن ابی اصیبعہ کی طبقات الاطباء میں ان کی کتابوں کی فہرست ملاحظہ فرمائیے۔
[3] پروفیسر زیر جوف۔

وغیرہ موضوعات پر ان کی بہت سی کتابیں ہیں۔ علمی تحقیقات نے اس امر کو پایۂ ثبوت تک پہنچا دیا ہے کہ بعض وہ کتابیں جو ان کی طرف منسوب ہیں خود ان کی کتابیں نہیں ہیں بلکہ ان کے شاگردوں اور ان کے مدرسہ کی علمی خدمات ہیں جو خود ان کی طرف منسوب ہو گئی ہیں۔

جب ہم اس بات کا احساس کرتے ہیں کہ حنین نے یونانی زبان سے ترجمہ کرنا شروع کیا تھا۔ اور ان کے سامنے سینکڑوں ایسے یونانی الفاظ آئے ہوں گے جن کا مرادف لفظ سریانی اور عربی زبان میں نہیں ہو گا۔ مثلاً طبی اور فلسفی اصطلاحات، نباتات، حیوانات اور ہیئت وغیرہ کے نام۔ اور انھیں مجبور ہونا پڑا ہو گا کہ ممکن ہو سکے تو ان کے مقابلہ میں عربی کے الفاظ ایجاد کریں اور اگر ایسا کرنا ممکن نہ ہو تو ان اجنبی الفاظ کو اس طرح صیقل کر دیں کہ وہی الفاظ عربی میں مستعمل ہو سکیں تو ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ انھوں نے کتنے بڑے کام کا بیڑا اٹھایا تھا جس سے ایک طاقت ور جماعت بھی بآسانی عہدہ برآ نہیں ہو سکتی اور محسوس کر سکتے ہیں کہ انھیں کس قدر مشقت برداشت کرنی پڑی ہو گی اور یہ بھی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ وہ اپنے اس کام میں کس قدر کامیاب تھے۔

میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ لاہور کی

مطبوعات

راولپنڈی میں —— ۱۔ لندن بک کمپنی۔ ایڈورڈ روڈ صدر
۲۔ مکتبہ اخوت۔ جامع مسجد روڈ

پشاور میں —— ادارہ اشاعت سرحد قصہ خوانی بازار

نوشہرہ میں —— منظور برادرز۔ صدر بازار

کیمبل پور میں —— خزینہ علم و ادب

لائل پور میں —— دانش کالج۔ ریل بازار

ان کے علاوہ دوسرے شہروں کے تاجران کتب [illegible] اگر ہماری مطبوعات لینا چاہتے ہیں تو براہ راست ہم سے خط و کتابت [illegible]

میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ۔ ۲۷۔ بی شاہ عالم مارکیٹ۔ لاہور

نقد و نظر

اسفر نامہ ابن بطوطہ

مختلف اصنافِ ادب میں، سفر نامہ کو خاص اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ اس میں جغرافیہ اور تاریخ کے علاوہ مختلف ممالک کی تہذیب، تمدن، معاشرت، معیشت، سیاست تقاریب، رسوم و رواج، مختلف اقوام و قبائل کا طرزِ بود و ماند۔ ان کی منفرد خصوصیات، غرضیکہ وہ سب کچھ آجاتا ہے جسے ہم معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ پھر چونکہ یہ مبنی ہوتا ہے سیاح کے ذاتی مشاہدات اور تجربات پر، اس لئے اس میں خشک سے خشک موضوع بھی شگفتہ و شاداب انداز سے پیش کیا جاتا ہے جس سے قارئین سفر کی طوالت سے اکتاتے نہیں۔ دنیا میں مختلف سیاحوں نے اپنے سفر نامے لکھے ہیں۔ ان میں ابن بطوطہ کے سفر نامہ کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ یہ سفر نامہ عربی زبان میں لکھا گیا تھا لیکن دنیا کی قریب قریب تمام ممتاز زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ اصل یہ ہے کہ ابن بطوطہ نے جو سفر نامہ لکھا تھا۔ وہ بہت مفصل اور طویل تھا۔ وہ ناپید ہے۔ اس کے رفیق، ابن جزی نے اس کی تلخیص کی تھی۔ وہی، "سفر نامہ ابن بطوطہ" کے نام سے مشہور ہے۔ اس سفر نامہ کا اردو ترجمہ اس سے پہلے بھی شائع ہوا تھا لیکن وہ اغلاط و اسقام سے خالی نہ تھا۔ اب اس کا جدید ترجمہ، رئیس احمد جعفری صاحب نے کیا ہے اور نفیس اکادمی ہاسپٹل اسٹریٹ، کراچی کی طرف سے شائع ہوا ہے۔ جعفری صاحب کو کتب عربی کو اردو میں منتقل کرنے کی بڑی مہارت حاصل ہے اور ان کے تراجم صاف اور شگفتہ ہوتے ہیں۔ یہی خصوصیات زیرِ تبصرہ ترجمہ میں بھی موجود ہیں۔ اس کے ساتھ ان کی طرف سے تشریحی حواشی نے مبہم مقامات کو واضح کر دیا ہے۔ یہ سفرنامہ دو حصوں پر مشتمل ہے، پہلا حصہ بلادِ اسلامیہ سے متعلق ہے اور دوسرا حصہ ہندوستان [illegible] اور ریاستہائے [illegible] کے بعض خطوں پر مشتمل۔ دوسرا حصہ زیادہ مفصل اور دلچسپ ہے۔ کتاب سوا آٹھ سو صفحات پر پھیلی ہوئی ہے اور مجلد کی قیمت پندرہ روپے ہے۔

(چرمی جلد کی قیمت بیس روپیہ ہے)

ابن بطوطہ ۷۰۳ھ میں طنجہ (مغرب اقصیٰ) میں پیدا ہوا۔ بائیس سال کی عمر میں سیاحت کے لئے نکل کھڑا ہوا۔ اور پچیس سال کے سفر کے بعد وطن کی طرف واپس لوٹا۔ وہ سب سے پہلے دیارِ حجاز میں پہنچا۔ اور اس کے بعد مصر۔ بغداد۔ دمشق۔ شام۔ عراق۔ ایران۔ ترکستان۔ بلخ۔ بخارا۔ بدخشاں۔ افغانستان۔ قسطنطنیہ اور مملکت ترکیہ کا دورہ کرتا ہوا ہندوستان کی طرف آنکلا۔ یہاں سندھ کے مختلف شہروں سے ہوتا ہوا، ملتان، ابوہر۔ پاک پٹن کے راستے دہلی پہنچا۔ وہاں سلطان محمد تغلق کا مقرب بنا اور منصب قضا پر فائز رہا۔ پھر سلطان کا سفیر بن کر چین گیا۔ ہندوستان میں واپسی پر مدراس، بمبئی، کرناٹک، کالی کٹ، مالابار، وغیرہ کی سیر کی۔ پھر لنکا اور سراندیپ سے ہوتا ہوا، واپس اپنے وطن بہ براہ افریقہ آیا۔ اس سیاحت میں وہ بادشاہوں، وزیروں، امیروں سے ملا۔ اصحاب قلم سے بھی ملاقاتیں کیں اور ارباب سیف سے بھی۔ اور جو کچھ دیکھا اسے ذہن میں محفوظ کرتا چلا گیا اور وطن پہنچ کر اس دلچسپ اور پرانہ معلومات داستان کو صفحۂ قرطاس پر منتقل کیا۔ اس سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ اس نے کیا کچھ دیکھا اور اس کے متعلق کیا کچھ لکھ کر سننے والوں کے لئے چھوڑ گیا۔

لیکن اس نے جو کچھ لکھا ہے وہ ایک سیاح کا سفرنامہ ہے۔ کوئی مستند تاریخ نہیں۔ بقول مترجم۔

> یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہیئے کہ ابن بطوطہ ایک جہانیاں جہاں گشت تو ضرور تھا لیکن وہ نہ کوئی مورخ تھا نہ ماہر طبقات الارض۔ نہ آثار قدیمہ کا محقق۔ نہ عہد قبل از تاریخ کی زبان کا حرف آشنا۔ گو علوم اسلامیہ سے اسے درک تھا لیکن نہ کوئی بڑا مفسر تھا نہ محدث۔ نہ فقیہ۔ نہ متکلم۔ وہ جو کچھ قدیم عہد کے بارے میں کہتا ہے وہ زیادہ تر سنی سنائی باتیں ہیں جن کا تاریخ سے کوئی واسطہ نہیں جو حدیثیں اور روایات درج کرتا ہے وہ بھی احتیاط کے ساتھ قبول کرنے کی مستحق ہیں جو باتیں سیر و تفریح کے بارے میں کہتا ہے گو وہ حد درجہ دلچسپ ہوتی ہیں لیکن ان میں بھی کہیں کہیں تضاد پایا جاتا ہے یا واقعہ سے مطابقت نہیں ہوتی۔ . . . . . پھر مزید ستم اس کی ضعیف الاعتقادی کا ہے۔ ہر ولی کے بارے میں جو کچھ سنتا ہے، درایت نظر انداز کر کے ہر روایت بلا تامل قبول کر لیتا ہے۔ (صفحہ ۶۹-۷۰)۔

اس لئے ہمیں اس سیاحت نامہ کو اسی نگاہ سے پڑھنا چاہیئے لیکن اس کا ایک گوشہ ایسا ہے جہاں پہنچ کر ہماری نگاہیں زمین میں گڑ جاتی ہیں۔ اور وہ گوشہ ہے جنسیات سے متعلق۔ اس سلسلہ میں مترجم رقمطراز ہے۔

> یوں تو حصہ اول کے مطالعہ سے بھی یہ بات واضح ہو گئی ہو گی کہ ابن بطوطہ کو بیویوں اور لونڈیوں سے بڑی دلچسپی تھی۔ جہاں داؤں لگ جاتا شادی کئے بغیر نہ رہتا۔ اور جب جیب بھاری ہوتی لونڈیاں بھی خرید تا اور داد عیش دیتا۔ لیکن ہندوستان میں آ کر تو وہ کھل کھیلا۔ یہاں اس نے

> کئی شادیاں کیں اور بہت سی لونڈیوں سے متمتع ہوا۔ اور حسنِ اتفاق سے جن لونڈیوں سے متمتع ہوا وہ قومیت کے اعتبار سے مختلف تھیں۔ اس وسیع و عریض ملک کے ہر خطہ کی آب و ہوا، اور آب وہوا کے اعتبار سے وہاں کے باشندوں کی جسمانی ساخت اور کیفیت جدا ہے چنانچہ سب سے زیادہ مرہٹہ اور مالدیپی عورتوں کا ذکر کیف و سرور اور وجد و نشاط کے عالم میں بار بار کرتا ہے۔ (صفحہ ۶۳ — ۱۶۲)۔

کیف و سرور اور وجد و نشاط کے عالم میں ہی نہیں بلکہ ایسے بے باک انداز میں جس سے شرم پناہ مانگے۔ ہم نے جو اوپر لکھا ہے کہ اس گوشے میں پہنچ کر ہماری نگاہیں زمین میں گڑ جاتی ہیں تو اس لئے کہ ابن بطوطہ ایسا عیاش کیوں تھا اور اس نے ان ماجریات کو ایسے بے باک انداز میں کیوں بیان کیا۔ وہ ایک سیاح تھا۔ اور اس سے زیادہ ہمارے نزدیک اس کی کوئی حیثیت نہیں۔ وہ بات جس سے ہم نے کہا ہے کہ ہماری نگاہیں زمین میں گڑ جاتی ہیں اور ہے۔

ابن بطوطہ نے جن ممالک کی سیر کی، وہ "اسلامی ممالک" تھے۔ ان ممالک کی کیفیت یہ تھی کہ وہ جہاں پہنچا، پان چھالیا اور پھل، مٹھائی کے ساتھ لونڈیاں بھی تحفوں میں چلی آتیں۔ وہ ان میں سے بعض کو اپنے لئے رکھ لیتا اور باقی اپنے رفقاء میں تقسیم کر دیتا۔ پھر جب جی چاہتا لونڈیاں بازار سے خرید تا۔ استعمال کے بعد انھیں بیچ ڈالتا۔ یا وہاں سے جاتے وقت، جس طرح دیگر اشیائے مستعملہ کو کباڑیوں کے حوالے کر دیتا، ان عورتوں کے ساتھ بھی یہی کچھ کرتا۔ اس کے علاوہ شادیاں بھی کرتا۔ ان سے اولاد بھی ہوتی۔ اور وہاں سے کوچ کے بعد ان بیویوں کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوتا۔ جو کچھ وہ کرتا، اس پر نہ اسے خود کچھ حجاب محسوس ہوتا اور نہ کسی اور کی نگاہ میں کھٹکتا۔ یعنی یہ تمام باتیں، مسلمانوں کے معاشرہ ——— اور اونچے معاشرہ ——— کا جزو تھیں جنھیں کسی جگہ بھی قابلِ اعتراض نہیں سمجھا جاتا تھا۔ یہ تھا آج سے چھ سات سو سال پہلے کا ہمارا اسلامی معاشرہ ——— کسی ایک ملک کا معاشرہ نہیں، قریب قریب ساری دنیا کے مسلمانوں کا معاشرہ۔

اس خرابی کی وجہ نہ تو ابن بطوطہ کی افتادِ طبیعت تھی اور نہ ہی اس دور کی کوئی خصوصی ابتری۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ بدقسمتی سے ہمارے ہاں (قرآنی تعلیم کے یکسر خلاف) یہ عقیدہ عام کر دیا گیا کہ اسلام میں غلامی جائز ہے۔ ایک شخص جتنی جی چاہے لونڈیاں رکھ سکتا ہے۔ اور جب جی چاہے چار عورتوں تک سے نکاح کر سکتا ہے۔ ان حالات میں جنسیت کی جو کیفیت ہو سکتی ہے ظاہر ہے؛ اور یہ عقیدہ کچھ اسی دور تک محدود نہیں تھا۔ آج بھی ہمارے اربابِ شریعت یہی کہتے ہیں۔

۲۔ فقہ الاسلام | یہ کتاب بھی نفیس اکادمی، بلاسس اسٹریٹ کراچی کی طرف سے شائع ہوئی ہے۔ اور حسین احمد الخطیب (مصری) کی عربی تصنیف کا اردو ترجمہ ہے۔ ترجمہ سید رشید احمد صاحب ارشد (ایم۔اے) نے کیا ہے۔ ضخامت پونے چھ سو صفحات۔ قیمت مجلد بارہ روپیہ۔

خطیب صاحب پہلے یہ نظریہ پیش کرتے ہیں کہ احکام شریعت کی تفصیلات، ہر زمانے کے لوگوں کی ضروریات اور مفادات کے مطابق بدلتی رہنی چاہئیں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں۔

> قرآن کریم میں تفصیلی احکام صرف ان مسلم الثبوت مسائل کے بیان کئے گئے ہیں جو زمانوں اور قوموں کے اختلاف سے نہیں بدلتے مگر دیگر معاملات کے صرف بنیادی اصول بیان کئے گئے ہیں اس طرح تفصیلات کے لئے ہر قوم اور ہر زمانے کے مجتہد کے لئے دروازہ کھلا ہوا ہے تاکہ وہ اس وقت کے لوگوں کی ضروریات اور مفادات کے مطابق نئے قوانین بنا سکیں اور ان کے ذریعے اس وقت کی خرابیوں کو دور کر سکیں کیونکہ ہمیشہ ایسی لازوال شریعت کے لئے جو ناقابل تنسیخ ہو یہی طریقہ مناسب ہے تاکہ ہر زمانے میں اس کے اصول کارآمد ہوں کیونکہ کوئی دوسری شریعت اس کی قائم مقام نہیں بن سکتی۔ (۱۱۰-۱۰۹)

یہاں صرف قرآن کریم کا ذکر ہے لیکن آگے چل کر اس کی وضاحت بھی کر دی گئی ہے کہ یہی پوزیشن سنت کی بھی ہے کیونکہ حضورؐ کو قرآن کے ساتھ قرآن کی مثل (مثلہ معہ) کچھ اور بھی دیا گیا ہے۔ لہٰذا سنت صرف قرآن کے اعمال کی تفصیل ہی نہیں بتاتی بلکہ وہ قرآنی احکام پر اضافے بھی کرتی ہے۔ قرآن ہی کی طرح حلال کو حلال اور حرام کو حرام قرار دے سکتی ہے اور مختلف حقوق کی فرضیت ثابت کر سکتی ہے۔ (۱۰۷)

لہٰذا ان کے نزدیک تبدیلی احکام صرف نقہ میں ہو سکتی ہے۔

یہ کتاب نہ فکری ہے نہ تنقیدی بلکہ محض معلوماتی ہے اور معلومات کو بھی تقلیداً پیش کرتی ہے۔ اس لئے بجز اس فرق کے کہ اس کے مصنف مصر کے رہنے والے ہیں، اس میں اور جو کچھ ہمارے ہاں کے قدامت پرست طبقہ کی طرف پیش کیا جاتا ہے۔ اس میں کچھ فرق نہیں۔ فرق ہو بھی نہیں سکتا، اس لئے کہ ان حضرات کی تعلیم ہر جگہ ایک ہی جیسی ہوتی ہے چنانچہ اس میں بھی (مثلاً) زنا کی سزا رجم (سنگسار کرنا) لکھی ہے اور غلامی کو جائز قرار دیا ہے۔ اس سے بھی آگے بڑھئے۔ تعدد ازدواج کے متعلق قرآن کریم میں ایک ہی آیت ہے اور وہ یوں ہے۔ وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتٰمٰی فَانْکِحُوْا مَا طَابَ لَکُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰی وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ..... (۴)۔

"اور اگر تمہیں خوف ہو کہ تم یتیمی کے بارے میں انصاف نہیں کر سکو گے ـــــ تو ایسی عورتوں سے نکاح کر لو جو تمہیں

پسند ہوں، دو دو، تین تین، چار چار..... آپ نے دیکھا ہوگا کہ ہمارے ہاں جب تعدّدِ ازدواج کا قرآنی حکم پیش کیا جاتا ہے تو عام طور پر اس آیت کے پہلے حصہ (وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتٰمٰی) کو حذف کر کے "فَانْکِحُوْا" سے آیت شروع کی جاتی ہے۔ آپ یہ دیکھ کر متعجب ہوں گے کہ خطیب صاحب نے بھی اس آیت کا پہلا حصہ حذف کر کے "فَانْکِحُوْا" سے آیت درج کی ہے۔ اور اس کی تمہید میں لکھا ہے۔

اس مشکل کا اسلام اور قرآنِ کریم کیا حل پیش کرتا ہے! اس نے مرد کے لئے ایک سے زیادہ شادیاں کرنے کی اجازت دی ہے بشرطیکہ تعداد چار سے آگے نہ بڑھے۔

یعنی قرآن کریم نے "قسط فی الیتٰمٰی" (یتیموں کے ساتھ انصاف نہ کر سکو) کی جو اولین شرط عائد کی ہے تمہید میں اس کا ذکر تک نہیں کیا گیا۔ اور اس کے بعد خود قرآن کریم کی آیت کا یہ حصہ بھی حذف کر دیا گیا ہے! یا للعجب۔

معلوم نہیں ہمارے ہاں کس نے اور کب یہ بات کہہ دی کہ اسلام میں احکام شریعت کے چار ماٰخذ (SOURCES) ہیں۔ یعنی قرآن، سنت، اجماع اور قیاس۔ ہم اسے صدیوں سے ایک مسلمہ کی حیثیت سے دہراتے چلے آرہے ہیں اور کبھی کھڑے ہو کر سوچتے نہیں کہ اس کا بالآخر مطلب کیا ہے؟ سب سے پہلے قرآن کریم کو لیجئے۔ اس میں بعض احکام یا قوانین متعین شکل میں دیئے گئے ہیں۔ جب اسلامی مملکت ان احکام یا قوانین کو نافذ کرے گی تو یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ ان احکام و قوانین کا ماٰخذ قرآن ہے۔ کہا یہ جائے گا کہ یہ قرآن کریم کے احکام و قوانین ہیں جنہیں ہم نے عملاً نافذ کیا ہے۔ بالفاظ دیگر قرآن کریم خود ہماری "قانون کی کتاب" ہے۔ ہمارے قانون کی ماٰخذ ہیں۔ اس کے بعد سنت کو لیجئے۔ اس میں انہی حضرات کے نظریہ کے مطابق جو "ماٰخذ اربعہ" کے قائل ہیں، یا تو قرآنی اصولوں کی روشنی میں تشریحی احکام ہیں یا قرآنی احکام پر اضافے۔ دونوں صورتوں میں سنت کے احکام کو مستقل احکام تسلیم کیا جاتا ہے۔ جب کوئی اسلامی مملکت ان احکام کو نافذ کرے گی تو یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ ان قوانین کی ماٰخذ سنت ہے۔ کہا یہ جائے گا کہ یہ سنت کے احکام ہیں۔ لہٰذا سنت بھی احکام شریعت کی ماٰخذ نہیں، بلکہ مستقل احکام کا ضابطہ ٹھہری۔

اس کے بعد اجماع اور قیاس کو لیجئے۔ ان کے متعلق کہا یہ جاتا ہے کہ جن امور کے متعلق کتاب یا سنت میں متعین احکام نہ ملیں، ان کے بارے میں کتاب و سنت میں بیان کردہ اصولوں یا ان کے ملتے جلتے احکام کی روح کو پیش نظر رکھ کر از روئے قیاس نئے احکام مرتب کئے جا سکتے ہیں۔ اور جب ان احکام پر اجماعِ امت ہو جائے، تو ان احکام کو شرعی حیثیت حاصل ہو جاتی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ قیاس اور اجماع قوانین شریعت کے ماٰخذ نہیں، بلکہ بعض حالات میں احکام مرتب کرنے کے طریقے ہیں۔ لہٰذا یہ کہنا بھی درست نہیں کہ "قیاس و اجماع" شریعت کے احکام کے ماٰخذ ہیں۔

ضمناً، اجماع کے متعلق محترم مصنف نے لکھا ہے کہ

اجماع کا مفہوم یہ ہے کہ کسی زمانے کے تمام مجتہدین اور علمائے کرام کسی مذہبی معاملہ میں متفقہ طور پر کوئی فیصلہ کریں۔ اس سلسلہ میں محض عوام کا اتفاق و اختلاف معتبر نہیں ہے۔ اسی طرح یہ بھی معتبر نہیں ہے کہ کچھ مجتہدین متحد ہوں اور کچھ مخالف ہوں۔ (صفحہ ۲۱)

اگر کوئی ان سے پوچھ بیٹھے کہ صاحب! قرن اولیٰ کے بعد (جب امت کی مرکزیت ختم ہوئی) آپ کوئی ایک مذہبی معاملہ بھی ایسا بتا سکتے ہیں جس پر امت کے تمام مجتہدین اور علمائے کرام متفق ہوئے ہوں، تو معلوم نہیں اس کا ان کی طرف سے کیا جواب ملے؟

حقیقت یہ ہے کہ "اجماع اور قیاس" کا صحیح طریقہ اور منشاء وہی ہے، جو ہمیں قرن اول میں دکھائی دیتا ہے۔ خلافت امت کی مرکزیت تھی۔ قانون سازی کا اختیار صرف اس مرکزیت کو حاصل تھا۔ جب کوئی معاملہ پیش ہوتا، یہ مرکزیت نمایندگانِ ملت کے مشورے سے اس پر غور کرتی۔ اور اس طرح اسلام کے غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں، اپنے لئے قانون وضع کر لیتی۔ ان قوانین میں تغیر حالات سے تبدیلی بھی ہوتی رہتی۔ لیکن جب خلافت، ملوکیت میں بدل گئی تو زمام سیاست حکومت کے ہاتھ میں رہی اور شخصی قوانین علماء کو تفویض کر دیئے گئے۔ ان قوانین کے متعلق عباسیوں کے عہدِ حکومت میں حالت یہ تھی کہ

مسلمان خلفاء اور حکام نے قاضیوں اور ججوں کو خود مختار بنا دیا تھا تاکہ وہ اپنی رائے اور اختیار کے مطابق مقدمات کا فیصلہ کریں یا کسی خاص امام کی تقلید کریں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک ہی شہر میں مختلف اور متضاد احکام جاری ہو گئے۔ (صفحہ ۳۲۶)

خطیب نے لکھا ہے کہ اس انتشار کی طرف خلیفہ ابوجعفر المنصور کی توجہ بھی منعطف کرائی گئی لیکن اس نے اس کی کچھ اصلاح نہ کی اور "انفرادی قانون سازی کا کام بدنظمی کی حالت میں رہا" اور اس کے بعد "تقلید کا جذبہ ہر خاص و عام پر مسلط ہو گیا"۔ یہی کیفیت آج تک چلی آ رہی ہے۔

"اسلام میں قانون سازی کا اصول کیا ہے"، اگرچہ اس مسئلہ کی اہمیت کسی زمانے میں بھی کم نہ تھی (یہ الگ بات ہے کہ اس سے پہلے اس کا صحیح اندازہ نہیں لگایا گیا) لیکن ہمارے زمانے میں اس سوال نے جس نزاکت اختیار کر لی ہے کہ گویا امت ایک ایسے دوراہے پر کھڑی ہے جہاں سے اگر ایک قدم بھی غلط سمت کی طرف اٹھ گیا تو نہ معلوم یہ قافلہ کہاں سے کہاں جا پہنچے۔ علامہ اقبالؒ نے اس نزاکت کا اندازہ آج سے تیس سینتیس سال پہلے لگایا تھا جب اس باب میں ترکی نے غلط قدم اٹھایا تھا (اگرچہ وہ ایسا کرنے پر مجبور کر دی گئی تھی) حضرت علامہؒ نے اس وقت لکھا تھا۔

آج جو مسئلہ ترکوں کو درپیش ہے وہ دوسرے بلادِ اسلامیہ کو پیش آنے والا ہے اور اس لئے

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسلامی قانون میں کیا فی الواقع مزید نشوونما اور ارتقاء کی گنجائش ہے۔ لیکن اس سوال کے جواب میں ہمیں بڑی زبردست کاوش اور محنت سے کام لینا پڑے گا، گو ذاتی طور پر مجھے یقین ہے کہ اس کا جواب اثبات میں ہی دیا جا سکتا ہے، بشرطیکہ ہم اس مسئلہ میں وہی روح برقرار رکھیں جس کا اظہار کبھی حضرت عمرؓ کی ذات میں ہوا تھا۔ وہ امت کے اولین دل و دماغ ہیں جو ہر معاملہ میں آزادئ رائے اور تنقید سے کام لیتے تھے اور جن کی اخلاقی جراءت کا یہ عالم تھا کہ حضورؐ رسالتمآب کی حالتِ نزع میں یہاں تک کہہ دیا کہ

حسبنا کتاب اللہ

ہمارے لئے اللہ کی کتاب کافی ہے۔ (خطبات (انگریزی) صفحہ ۱۵۴)

زمانہ انتظار میں ہے کہ عمرؓ کی روح کو برقرار رکھنے والی یہ آواز کب اور کدھر سے اٹھتی ہے، گو اس وقت اپنوں اور بیگانوں، سب کی متفقہ کوشش یہ ہے۔ کہ یہ آواز کہیں سے نہ اٹھنے پائے۔ لیکن خدا کے دین کو تو آخر الامر غالب آکر رہنا ہے۔

پرویز صاحب کی گرانمایہ تصنیف

سلیم کے نام خطوط

مفسر قرآن محترم پرویز صاحب کا مخصوص دل کش، شگفتہ اور آسان فہم انداز نگارش

جلد اوّل۔ آٹھ روپے، جلد دوم۔ چھ روپے، جلد سوم۔ چھ روپے

ملنے کا پتہ:۔ میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ، ۲۔ بی۔ شاہ عالم مارکیٹ۔ لاہور

تیری نظر میں ہیں تمام میرے گذشتہ روز و شب

اقبالؒ

احتساب

(۳)

ہم اس سے قبل گذشتہ دو اشاعتوں میں عنوانِ بالا کے تحت یہ بتلاتے چلے آ رہے ہیں کہ گذشتہ تیرہ برس میں طلوعِ اسلام نے حکومت اور عوام کو کن اہم مسائل پر اور کس جراءت رندانہ سے مخاطب کیا۔ اور کس تعمیری انداز میں اربابِ اقتدار کی لغزشوں اور کوتاہیوں کو بے نقاب کرتے ہوئے قدم قدم پر صحیح منزل کی نشان دہی کی۔ اب تیسری قسط ملاحظہ فرمایئے۔ (طلوعِ اسلام)

۱۹۶۲ء کا آغاز ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ہی طلوعِ اسلام کا نئے سال کا پہلا شمارہ (جنوری ۱۹۶۲ء) غمِ منزل کے رستے ہوئے ناسوروں اپنی پہنائیوں میں لئے منظرِ اشاعت پر آتا ہے۔ اس کے لمعات (مقالہ افتتاحیہ) بھٹکے ہوئے راہی کیلئے نشانِ منزل کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان کالموں میں اس نے سب سے پہلے ایک بہت بڑی خود فریبی کا پردہ یوں چاک کیا۔

ہم اپنے افلاسِ تدبر اور فقدانِ اہلیت کو چھپانے اور اس طرح اپنے آپ کو فریب میں مبتلا رکھنے کے لئے لاکھ کہیں کہ مسلمانوں نے حصولِ آزادی کی خاطر اس قدر قربانیاں دی ہیں، لیکن اس طرح خونِ ناحق کے وہ دھبے کبھی نہیں مٹ سکتے جن سے ہم زمانے کی ریگِ رواں کو شفق آگیں بنا چکے ہیں۔ نہ ہی وہ لٹی ہوئی عصمتیں واپس مل سکتی ہیں جو ناموس و شرافت کی ہر عدالت میں ہماری بے حیثی کی زندہ شہادتیں ہیں۔ ہم ہیں ہے وہ کبوترانِ حرمؑ جو تقسیمِ ہند کی قیامت سے پہلے ہی اڑ کر بامِ پاکستان پر آ بیٹھے تھے۔ انھیں کیا علم کہ صحنِ گلستان سے باہر مرغانِ رشتہ برپا

۱۔ تو لائے کبوتر بامِ حرم چہ می دانی — طپیدنِ دلِ مرغانِ رشتہ برپا را

پر کیا گذری؟

رستے میں کون لٹ گیا منزل کو کیا خبر کشتی کے ڈوب جانے کی ساحل کو کیا خبر

خاروں سے پوچھئے نہ کسی گل سے پوچھئے
صدمہ چمن کے لٹنے کا بلبل سے پوچھئے

لیکن مسلمانوں نے یہ ساری لرزہ انگیز مصیبتیں اور قیامت خیز صعوبتیں اس لئے برداشت کیں کہ ان میں ذہن میں تھا کہ وہ محکومی اور غلامی کے انسانیت سوز جہنم سے نکل کر، حریت و آزادی کی انسانیت ساز جنت کی طرف جا رہے ہیں۔ کس قدر حسین تھا یہ خیال اور کیسی دل کش تھی یہ تمنا۔ اس بات کو قریب ساڑھے چار برس گزر گئے۔ سوال یہ ہے کہ ان عوام نے، جو سر پر یہ سودائے کر آئے تھے، اس جنت کو پا لیا؟ (جنوری ۱۹۵۲ء۔ صفحہ)

"نازک مزاج شاہاں"

اور اس کے بعد اس نے "نازک مزاج شاہاں تابِ سخن ندارند" کی المناک تفصیل پیش کرتے ہوئے "اپنی قومی آپ بیتی" کو بالفاظِ ذیل سپردِ قلم کیا۔

مشکل یہ ہے کہ ہمارے ارباب حل و عقد کچھ ایسے چھوئی موئی واقع ہوئے ہیں کہ پاکستان کی داخلی کمزوریوں کا ذرا سا بھی ذکر چھیڑیئے، ان کا کلیجہ فوراً دھک دھک کرنے لگ جاتا ہے کہ ان پر کوئی آفت آئی۔ یحسبون کل صیحۃ علیھم۔ کہیں پتہ کھڑکا اور انہوں نے کان کھڑے کر لئے۔ کونسا ملک ہے جس میں کمزوریاں نہیں اور کونسی قوم ہے جو لغزشوں اور کوتاہیوں سے منزّہ ہے۔ لیکن فرق یہ ہے کہ خوش نصیب ممالک اور فیروز بخت اقوام اپنی کوتاہیوں اور کمزوریوں کو دل کے کانوں سے سنتی ہیں اور پھر ان کی تلافی کی کوشش کرتی ہیں۔ اس طرح رفتہ رفتہ سیئات مبدل بہ حسنات ہوتی چلی جاتی ہیں لیکن جن قوموں کے ستارے گردش میں ہوں" وہ اپنی کمزوریوں کے تذکرے سننا کبھی گوارا نہیں کرتیں۔ اس سے ان کا خون کھولنے لگ جاتا ہے۔ ان کی پیشانی پر جبر کے نقشے بننے شروع ہو جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نہ ان کے عیوب و اسقام ان کے سامنے آتے ہیں اور نہ ان کی اصلاح کی کوئی صورت پیدا ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں بدبختی سے یہی صورت پیدا ہو چکی ہے۔ اس لئے یہاں ہر سوچنے والا دماغ گویم مشکل و گر نہ گویم مشکل کی کشمکشِ پنہاں میں مبتلا رہتا ہے جو (بقول غالب) اس کے دلِ پُر حسرت کو طلسمِ پیچ و تاب بنائے رکھتی ہے۔ (ایضاً)

پاکستان سے مقصود کیا ہے؟

پاکستان کے نازک مزاج اور نئے نویلے حکمران عوام کی زبانوں کو مہر بہ لب رکھنے کے لئے یہ فرماتے رہا کرتے تھے کہ "پاکستان کا تحفظ" سب سے مقدم ہے۔ طلوعِ اسلام نے اس کا بجا طور پر اعتراف کیا لیکن پاکستان کے تحفظ سے مراد کیا ہے؟ اس نے اس کی وضاحت ضروری سمجھی، چنانچہ مندرجہ بالا حقائق کی تفصیل کے بعد اس نے "تحفظ پاکستان" کی اہم حقیقت کو تفصیل میں لاتے ہوئے لکھا۔

> پاکستان کے استحکام سے مقصود یہ ہے کہ یہ ہمارے تصورات حیات اور نظریات زندگی کی کہکشاں گیر عمارت کی بنیاد ہے۔ یہ بنیاد ہمارے پاس موجود ہے۔ ہم نے اسے جان دے کے پایا اور مر مر کے بسایا ہے۔ ہم اپنے خون سے اس کی حفاظت کریں گے لیکن اس بنیاد پر کوئی عمارت بھی تو بنے! پاکستان کی ساڑھے چار سالہ زندگی پر غور کیجئے اور پھر سوچئے کہ اس پر ایک ردا بھی کہیں رکھا گیا ہے؟ یہ ٹھیک ہے کہ ملک میں ایک طبقہ ایسا پیدا ہو گیا ہے جس کے ہاں دولت سیلاب کی طرح امنڈ سے چلی آ رہی ہے حتیٰ کہ اب ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اس دولت کو کریں کیا؟ لیکن قوم اس طبقے کا نام تو نہیں۔ قوم تو ان سے الگ، کہیں اور بستی ہے! بستی کا ہے کو ہے، زندگی کے سانس گن رہی ہے۔ لیکن اس طبقے کے محلات اس قدر بلند ہیں کہ وہاں سے نیچے فٹ پاتھ پر ایڑیاں رگڑنے والی قوم دکھائی تک بھی نہیں دیتی۔ دولت کی فراوانی سے کوئی عیب ایسا نہیں جو ان کی سوسائٹی میں حسن نہ بن چکا ہو۔ کوئی برائی ایسی نہیں جس کا لائسنس عام نہ ہو چکا ہو۔
>
> گذر گیا اب وہ دور ساقی کہ چھپ کے پیتے تھے پینے والے
> بنے گا سارا جہان میخانہ، ہر کوئی بادہ خوار ہوگا (ایضاً صہ!!)

ارباب حکومت و شریعت کا گٹھ جوڑ

یہ کچھ بیان کرتے ہوئے اس نے تصویر کے ایک اور گوشے سے نقاب اٹھا۔ یہ گوشہ تھا "ارباب سیاست" اور "ارباب شریعت" کی ملی بھگت کا عجیب و غریب پہلو۔ نقاب کشائی کا یہ فریضہ ادا کرتے ہوئے "طلوعِ اسلام" نے لکھا۔

> "اربابِ شریعت" سے اس طبقے کا سا جھا ہے اور اس کی وجہ سے یہ حضرات بھی اس ٹھاٹھ کی زندگی بسر کر رہے ہیں جو تشکیل پاکستان سے پہلے ان کے حیطۂ تصور میں بھی نہیں آ سکتی تھی۔ انھیں اب وہ سب کچھ (کوٹھیاں، ٹیلی فون، موٹریں، فیکٹریاں) میسر ہے جنھیں اس سے پہلے، یہ للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا کرتے تھے۔ اور اپنی ہوسِ ناکام کی تسکین کے لئے ان چیزوں کو "دنیا کے

کتوں کا حصہ بٹایا کرتے تھے۔ ان میں سے جس کے حصے میں کچھ کمی ہو جاتی ہے وہ ارباب ثروت و اقتدار کی پارٹیوں کی شراب اور ان کی بیویوں کی بے پردگی کو چوراہے میں اچھالتا ہے اور جب اس کا مقصد حاصل ہو جاتا ہے تو پھر بر سرِ منبر گنگنانا شروع کر دیتا ہے کہ

حکومت نے آزادیاں تم کو دی ہیں
ترقی کی راہیں سراسر کھلی ہیں

اسلامی کارنامے؟ اور اس کے بعد ان اربابِ شریعت کی بارگاہ سے اربابِ اقتدار کے حق میں کیا کیا قصیدہ آرائیاں ہوتی ہیں وہ بھی طلوعِ اسلام کے الفاظ میں سن لیجئے۔

جس طرح اس سے پہلے، اسکولوں کے بچے "عہدِ انگلشیہ کی برکات" دہرایا کرتے تھے، یہ حضرات دنیا کی اس سب سے بڑی اسلامی مملکت کی "اسلامی خدمات" کی فہرست گنانا شروع کر دیتے ہیں۔ مثلاً قرارداد مقاصد پاس کر دینے سے یہ مملکت مسلمان ہو گئی ہے۔ رمضان شریف میں شراب کی دکانیں بند کرا دی جاتی ہیں اور ہوٹلوں کے دروازوں پر پردے لٹکا دیئے جاتے ہیں۔ تراویح کی نماز کے لئے بدھنے اور مصلے بہم پہنچا دیئے جاتے ہیں۔ ٹریم کا وقت بارہ بجے رات تک بڑھا دیا جاتا ہے۔ رمضان میں دفاتر کے اوقات میں تبدیلی کر دی جاتی ہے جمعہ کے مبارک دن کو دفاتر بارہ بجے بند کر دیئے جاتے ہیں۔ محرم میں ریڈیو پر گانے کے ساتھ ساز نہیں بجائے جاتے۔ کسی بڑے آدمی کی وفات پر ریڈیو سے مسلسل قرآن خوانی ہوتی رہتی ہے۔ ریڈیو کی نئی عمارت میں قرآنِ کریم کی آیت (قولوا للناس حسنا) نہایت جلی حروف میں لکھی گئی ہے۔ کراچی ایڈمنسٹریشن نے فطرانے اور کھالیں جمع کرنے کا کام اپنے ذمے لے لیا ہے۔ ریلوے سٹیشنوں پر قبلے کا رُخ دکھانے کے لئے تیر کے نشانات لگا دیئے گئے ہیں.... ٹرو مین کو قرآن شریف بطور تحفہ دیا گیا ہے۔

اب اور چاہتے کیا ہو ——— ہمبری مل جائے؟

قوم یہ وعظ سنتی ہے اور "یا اللہ تیرا شکر" کہہ کر پھر فٹ پاتھ پر ایڑیاں رگڑنے لگ جاتی ہے۔ (ایضاً۔ صـ۱۲)

کیا حصولِ پاکستان سے مقصد یہی تھا؟ سوال پیدا ہوتا تھا اور بڑا اہم تھا یہ سوال، کہ کیا ان (مذکورہ) "کارناموں" سے حصولِ پاکستان کا مقصد تکمیل

پا گیا۔ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے طلوعِ اسلام نے سب سے پہلے ہماری دُکھتی رگ کو چھیڑا اور پوچھا۔

کیا یہی ہے وہ عمارت جس کے لئے پاکستان کو بطور اساس و بنیاد حاصل کیا گیا تھا؟ کیا یہی تھا وہ مقصد جس کے لئے مسلمان نے اسے جان دے کے پایا اور مر مر کے بسایا تھا؟ کیا یہ بعینہٖ وہی کچھ نہیں جو مسلمانوں کے دیگر ممالک، مثل افغانستان، ایران، عراق، نجد، حجاز وغیرہ میں ہو رہا ہے؟ اگر یہ وہی کچھ ہے تو کیا یہاں بھی اس کے وہی نتائج نہیں نکلیں گے جو ان ممالک میں برآمد ہو چکے ہیں اور جن کی وجہ سے وہ دنیا کی قوموں کی کسی قطار اور شمار میں ہی نہیں۔ وہاں بھی یہی کیفیت ہے کہ ایک طبقہ سب کچھ سمیٹے اور سمیٹے ہوئے ہے اور باقی قوم کیچڑ کے کیڑوں کی طرح رینگتی ہوئی زندگی کے دن پورے کر رہی ہے۔ یہ سب اسلامی ممالک کی شان ہے۔　　(ایضاً صـ۱۲-۱۳)

ملحدوں کے ممالک میں

اسلامی ممالک کی اس صورتِ حال کا بے دینوں اور ملحدوں کے ممالک (انگلستان اور جاپان وغیرہ) سے تقابل کرتے ہوئے طلوعِ اسلام نے اپنے مخصوص تمثیلی انداز میں دلوں کے تاروں کو جھنجوڑا اور کہا۔

...... وہاں کوئی شخص جانتا ہی نہیں کہ جھوٹ بولنا کسے کہتے ہیں۔ مکانوں میں تالا لگانے کا سوال ہی نہیں ہوتا۔ وہاں کسی کی کوئی چیز چوری جاتی ہی نہیں۔ وہاں ریلوں میں ٹکٹ کوئی نہیں پوچھتا کیونکہ وہاں کوئی شخص بلا ٹکٹ سفر ہی نہیں کرتا۔ ان کی لغت میں گالی کے لئے کوئی لفظ نہیں۔ یہ ملحدوں اور بے دینوں کے ممالک ہیں۔ ان کی طرف دیکھیئے اور ———— باز بخوشتن نگر۔

آپ یہ سب کچھ سننے کے بعد کہدیں گے کہ

کچھ ہوش میں آنے کی میسّر شکل بھی نا ہے!
یہ میں بھی سمجھتا ہوں مجھے ہوش نہیں ہے　　(ایضاً۔ صـ۱۳)

نشانِ راہ کیا ہے؟

ایک مخلص اور غم گسار جراح کی طرح تلخ نوائیوں کے یہ نشتر بروئے کار لانے کے بعد طلوعِ اسلام نے زخموں کے اندمال اور قومی نشاۃِ ثانیہ کی نشاندہی کی (یہ حل قرآن کریم کی بارگاہِ عظیم سے ہی مل سکتا تھا)۔ یہ وہی صورت تھی جو صاحب ضربِ کلیم، بنی اسرائیل کے شاہین بچوں کی تربیت کے ذریعے بروئے کار لائے تھے۔ اسے پیش کرتے ہوئے فکرِ قرآنی کے نقیب نے پکارا۔

"ہوش میں آنے کی شکل" نہ تو ان اسمبلیوں سے پیدا ہو سکے گی۔ نہ وزارتوں کے کابینوں سے

نہ یہ ملا کے حجروں سے ابھرے گی، نہ شیخ طریقت کی خانقاہوں سے۔ اس کی ابتدا (جیسا کہ ہم شروع سے کہتے چلے آرہے ہیں) درس گاہوں سے ہوگی۔ قرآن کریم نے اس کی یہی شکل بتائی ہے جب اس نے کہا نظام ربوبیت کے قیام کی صورت یہ ہے بما کنتم تعلمون الکتاب وبما کنتم تدرسون۔ ضابطہ خداوندی کو سمجھنا سمجھانا اور اسے اس قدر دہرانا کہ یہ دلوں میں اتر جائے۔ ہم نے اس سے پہلے بھی کہا تھا اور آج اسے پھر دہراتے ہیں کہ جو لوگ اس طریق کار کی اہمیت کو پہچانتے ہوں۔ وہ سر تسلیم بن کر اٹھیں اور ملک میں دو چار ایسی درس گاہیں قائم کر دیں جن میں قرآن کریم کی تعلیم دی جائے — ملا کے قرآن کی نہیں، خدا کے قرآن کریم کی — جو انسان کو صرف تسخیر ارض و سما کے راز ہی نہیں بتاتا بلکہ اس پر اقطار السموات والارض سے آگے نکل جانے کی راہیں بھی کشادہ کر دیتا ہے۔ ان تجہرانوں کو چھوڑ دو کہ جنھوں نے جو کچھ بننا تھا بن چکے۔ اپنی تمام توجہات مرکوز کر دو ان سیال قلوب (یعنی آنے والی نسلوں) پر جنھیں تم جس قالب میں ڈھالنا چاہو، ڈھال سکتے ہو۔ اس سرزمین کی حفاظت کا انتظام رکھو، اور اس متاعِ عظیم کے امین تیار کرنے کے لئے درس گاہیں تیار کر دو...... دس پندرہ برس تک، نہایت خاموشی سے ان درس گاہوں کو مصروف تعلیم و تربیت رکھو۔ اس کے بعد دیکھو کہ ان سے کس کس قسم کے شاہباز نکلتے ہیں۔ اسی قسم کے شہباز کہ

نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو الٹ دیا تھا

سیاست والوں کے ہنگامے انکے حوالے کر دو۔ بزنس والوں کو چور بازاری کی بھول بھلیوں میں الجھا رہنے دو۔ یہ سب میدان ان کے لئے چھوڑ دو اور تم قوم کے بچوں کو سنبھال لو۔ تم دیکھو گے کہ آخر الامر ان سب کی مساعی کاسد ثابت ہوگی۔ ان کے کاروبار میں نقصان کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوگا۔ ان کی کھیتیاں جھلس کر رہ جائیں گی لیکن جس تخم صالح کی آبیاری تم کرو گے وہ ایک دن ایسا تناور درخت بن جائے گا جس کی شاخیں فضائے عالم میں مسرتوں کے جھولے جھول رہی ہوں گی۔

کشجرۃ طیبۃ اصلھا ثابت وفرعھا فی السماء (۱۴/۲۴)

قائد اعظم کا ورثہ طلوعِ اسلام کی اسی اشاعت میں ایک مضمون "مسلم لیگ کی سیاست" کے عنوان سے قومی زندگی کے بنیادی مسائل کو زیر بحث لایا گیا اور بتلایا گیا کہ ارباب اقتدار کے

اس بلند بانگ دعوے کا محاسبہ کیا گیا کہ چونکہ مسلم لیگ نے پاکستان کو حاصل کیا اس لئے اسے ضرور بالضرور باقی رہنا چاہیئے۔ طلوعِ اسلام نے اس قرآنی نقطۂ نظر کی ایک بار پھر وضاحت کی کہ ایک اسلامی مملکت میں ملت کے اندر کسی پارٹی کا وجود قابلِ قبول نہیں ہو سکتا اور حصولِ پاکستان کے بعد مسلم لیگ یا کسی اور پارٹی کو باقی رکھنا کسی لحاظ سے بھی وجہ جواز نہیں رکھتا چنانچہ عنوان بالا کے تحت اس نے سب سے پہلے اربابِ اقتدار اور دیگر سیاسی طالع آزماؤں کی ان جذباتی اپیلوں کا جائزہ لیا جو بھولے بھالے عوام کو مبتلائے فریب کرنے کے لئے چاروں طرف گونج رہی تھیں۔ اس نے لکھا۔

> ملت یا ملی نظام کے کبھی دو مرکز نہیں ہو سکتے ــــــ اور جب بھی کوئی گروہ اس "شرک" کا مرتکب ہوا ہے وہ انتشار و خلفشار ہی کا شکار رہا ہے۔ چونکہ عام مسلمان ایک طرف اس نازک فرق کو نہیں سمجھ سکتے اور دوسری طرف وہ جذباتی واقع ہوئے ہیں اس لئے ان سے خالصۃً جذباتی اپیل کی جاتی ہے اور قائدِ اعظم کے نام کا واسطہ دے کر مسلم لیگ کے باقی رکھنے کی درخواستیں کی جاتی ہیں۔ یہ حضرات کہتے ہیں کہ مسلم لیگ قائدِ اعظم کا ترکہ ہے۔ اول تو یہ کہنا ہی "قائدِ اعظم" کی توہین ہے، کیونکہ ان کا حقیقی ترکہ پاکستان ہے نہ کہ مسلم لیگ، یہی ان کی عمرِ عزیز کا ماحصل تھا۔ اسی لئے وہ مصروفِ جد و جہد رہے۔ اور اسی کے تحفظ میں بقیہ عمر صرف کر دی۔ لہٰذا ان کا ورثہ پاکستان ہے اور قائدِ اعظم سے عقیدتمندانہ وابستگی کا تقاضا ہے کہ ہم پاکستان کو مضبوط و خوشحال بنائیں . . . . . .
>
> پھر وضاحت سے سن لیجئے کہ گفتگو کی یہ اساس ہی غلط ہے۔ مسلم لیگ قوم کا چولہ ہے جسے اس نے بدل دیا۔ اب وقت کو پیچھے نہیں لوٹایا جا سکتا کہ پھر وہی کرتے کو زیبِ تن کر لیا جائے۔ یہ اسی دوعملی اور "قومی شرک" کا نتیجہ ہے کہ ملی زندگی میں قدم قدم پر مضحکہ خیز حرکتیں ہو رہی ہیں۔
>
> (شمارہ جنوری ۱۹۵۲ء - صفحہ ۵۳)

قیامت کا پیش خیمہ

اس کے بعد واقعات اور حقائق کی روشنی میں طلوعِ اسلام نے تفصیلاً بتایا کہ کس طرح قائدِ اعظم کی صدارت میں مسلم لیگ نے یہ اہم فیصلہ کیا تھا کہ سرکاری عہدیدار وزراء وغیرہ مسلم لیگ کے عہدیدار نہیں بن سکتے۔ لیکن قائدِ اعظم کے سانحہ ارتحال کے بعد کس طرح اس فیصلے کی مٹی پلید کی گئی۔ کس طرح مرکزی وزیرِ اعظم مرکزی مسلم لیگ کے منصبِ صدارت پر قابض ہو گئے اور ان کی تقلید میں کس طرح تمام صوبائی وزرائے اعلیٰ نے اپنے اپنے صوبوں میں مسلم لیگ کا منصبِ صدارت سنبھال کر اسے کلیتہً حکومت کی لونڈی

بتالیا کس طرح وزارت وصدارت کی اس "وحدت" کے زور پر صوبائی انتخابات میں دھاندلی مچائی گئی اور اس دھاندلی اور تشدد کے زور پر الیکشن جیت کر نہ صرف مسلم لیگ کی صفوں میں سر پھٹول کی صورت پیدا کر دی بلکہ پورے ملک کی سیاسیات کو علاقائی سازشوں کی آماجگاہ بنا کر مملکت کے سیاسی استحکام کو خطرے میں ڈال دیا گیا۔ یہ ساری تفصیل پیش کرنے کے بعد اس نے لکھا۔

> یہ کچھ سرحد پر ہی موقوف نہیں۔ پنجاب میں بھی انتخابات ہو چکے ہیں جہاں ہر شخص یہ کہہ رہا ہے کہ پیسے اور پولیس نے مسلم لیگ کو کامیاب بنا دیا۔ انتخابات سے پیشتر پنجاب میں جو ہڑبونگ مچی تھی اس کی یاد اب تک تازہ ہے۔ اس وقت سندھ میں آئین و سیاست کو جس طرح ذلیل و رسوا کیا جا رہا ہے وہ انتہائی شرمناک ہے۔ بلوچستان اور مشرقی پاکستان ان سے بہتر نہیں مسلم لیگ پاکستان کو ایک خطرناک وادی میں لے آئی ہے۔ چند آدمی دولت و اقتدار کی جنگ لڑ رہے ہیں اور ان کے قدموں کے نیچے نادار، بھوکے، ننگے، مریض، جاہل عوام خاک میں لوٹ رہے ہیں۔
>
> فلک نے ان کو عطا کی ہے خواجگی کہ جنہیں
> خبر نہیں روشِ بندہ پروری کیا ہے
>
> بزمِ سیاست پر مردنی چھائی ہوئی ہے۔ جہاں تک نام نہاد جمہوری اداروں کا تعلق ہے وہ معطل و بے کار پڑے ہوئے ہیں، قوم سیاسی پارٹیوں سے بھی بددل ہے اور حکومت سے بھی نالاں ہے۔ اس کی قوتِ فکر معطل ہو چکی ہے اور قوائے عملیہ مضمحل۔ انہیں زندگی اور اس کے حقیقی ہنگاموں سے دلچسپی نہیں رہی۔ اس قبرستان میں بھی قیامت آئے گی کبھی؟ اگر یہ درست ہے کہ
>
> ہر موت کا پوشیدہ تقاضا ہے قیامت
>
> تو قیامت کا اس سے موزوں وقت اور کونسا ہو سکتا ہے؟ (ایضاً۔ صفحہ ۵۹۔۶۰)

کراچی کے دوستو! آیئے ہر اتوار کی صبح کو ساڑھے نو بجے سندھ اسمبلی ہال (بندر روڈ) میں مفکرِ قرآن محترم پرویز صاحب کے الفاظ میں سنئے کہ قرآن عصرِ حاضر کے ہر چیلنج کا علی وجہ البصیرت کیا جواب دیتا ہے۔ اور مسائلِ زندگی کا کس قدر نکھرا ہوا حل پیش کرتا ہے

(اتحاد پریس شبلی روڈ لاہور)